دھوپ
اور
سمندر
انتخاب و ترتیب
سہ پائے
تخلیقی افسانوں کا انتخاب

دھوپ اور سمندر

دھوپ اور سمندر

(تخلیقی افسانوں کا انتخاب)

انتخاب و ترتیب

کمار پاشی

ناشر

سطور پرکاشن، ۳۳/۱ دہلی گیٹ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲-

منظر نامہ

تخلیقی افسانہ

باقر مہدی نے (ہندی افسانہ نگار) نرمل ورما کے حوالے سے بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ "جب ہم نئے افسانے کی بات کریں تو ہمیں مختصر افسانہ کی موت سے اپنی بحث کا آغاز کرنا چاہیے"۔ ان کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ "(اُردو کے) نئے افسانہ نگار اتنے سرکش نہیں ہیں کہ (افسانے) کی ہئیت کے سلسلے میں کچھ توڑ پھوڑ کو روا رکھیں"۔

جہاں ایک طرف باقر مہدی اُردو افسانے کے "افسانہ پن" سے گریز کا ذکر کرتے ہیں وہاں اپنے دل میں بیدی اور منٹو کے لیے ایک نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں۔ باقر مہدی یقیناً پیشہ ور ناقد نہیں ہیں لیکن ان کا یہ متضاد رویّہ اُن پیشہ ور مدرسی نقادوں سے مختلف بھی نہیں جو نئے افسانے کو پریم چند کی افسانوی روایت سے منسلک کرتے ہوئے لولی لنگڑی اُردو تنقید پر ذرا سا بھی رحم نہیں کھاتے۔

اسے اُردو شعر و ادب کی بدنصیبی کہیے کہ اس نے اپنے ارتقائی سفر میں مولانا حالی کی رہبری قبول کر لی، جس نے شاعروں اور ادیبوں کی ایک پوری پلٹن کو اخلاقیات کا درس دے کر قوم کی خدمت پر مامور کر دیا۔ یہ قریب قریب وہی زمانہ تھا جب فرانس میں بادلیئر کی نظموں کی ایک مختصر سی کتاب شایع ہوئی تھی جس کی پیشانی پر لکھا تھا

کہ یہ نظمیں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لیے نہیں ہیں۔ اُردو شاعری میں حالی سے لے کر اقبال تک اور ان سے ذرا نیچے اتریں تو ترقی پسندوں تک اور فکشن میں پریم چند سے لے کر منٹو تک آتے آتے اُردو ادب رائج الوقت اخلاقی اور سماجی اقدار کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں پریم چند کے ساتھ منٹو کے ذکر پر شاید بہت سوں کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے ارادتاً پریم چند کے ساتھ کرشن، بیدی، قاسمی وغیرہ کے ذکر سے گریز کیا ہے اور وہ اس لیے کہ ان افسانہ نگاروں کو عام طور پر پریم چند کی روایت سے منسلک سمجھا جاتا ہے لیکن منٹو کو اس قطار سے اکثر الگ دکھایا جاتا ہے، جبکہ پریم چند اور منٹو کے یہاں ذہنی رویّوں میں ذرا سے فرق کے باوجود اعلیٰ مقاصد کے حصول کی وہی کارفرمائی نظر آتی ہے جس کا سلسلہ حالی کے اخلاقی اسباق سے جاملتا ہے۔

پریم چند مروّجہ اخلاقی اقدار کے سلسلے میں اس قدر راسخ تھے کہ ان کے نزدیک انسانی زندگی کا صرف ایک ہی پہلو تھا، اس کا مثبت پہلو۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ یقیناً ہر انسان کو اپنے افسانے اور ناول پڑھوا پڑھوا کر ہشت صفت انسان سے یک صفت فرشتہ بنا دیتے۔ شاید ان کا کُل اندوختہ ایک ایسا سکّہ تھا جس کے دونوں طرف اخلاقیات کی تصویر کندہ تھی۔ انھوں نے اپنے مرتبان کو اعلیٰ اور مثالی کرداروں سے ٹھساٹھس بھر رکھا تھا، جنھیں وہ باری باری چمٹے سے باہر نکال نکال کر قارئین کی خدمت میں بحالی صحت کے لیے پیش کرتے رہتے تھے۔

اس کے برعکس منٹو نے خود کو شعوری سطح پر پریم چند کی نسل سے الگ کرنے کی خاطر اپنے افسانوں کے لیے جن منفی کرداروں کا انتخاب کیا وہ بھی بالآخر عام انسانی اقدار اور اخلاقیات کے درس خواں ثابت ہوئے مثلاً اس کی کہانی "سہائے" کا یہ ابتدائی (یا تمہیدی) پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

> یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں، یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے

ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا، اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ذرا سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بیوقوف ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جا سکتے ہیں۔ مذہب دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے۔

یہ پورا پیراگراف پڑھنے کے بعد آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مولانا حالی، سرسید، اقبال اور ترقی پسندوں کا زندگی سے متعلق رویّہ بالکل اسی طرح کا عمومی اور یک سطحی تھا اور یہاں آپ شمس الرحمٰن فاروقی کی اس بات سے بھی متفق ہوں گے کہ "اگر زبان ایک دولت ہے، شعر اس کو پوری طرح استعمال کرتا ہے کیونکہ وہ اس سے خوف نہیں کھاتا۔ افسانہ بے چارہ گھبرا جاتا ہے۔ اور اس کا اسراف بے جا کرنے لگتا ہے۔" یہ اور ایسی ہزاروں مثالیں پریم چند سے لے کر منٹو تک (اور منٹو سے لے کر موجودہ دور تک کے غیر تخلیقی اور روایت سے منسلک افسانہ نگاروں تک) کے افسانوں میں بہ آسانی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہ بات ان افسانہ نگاروں کے متعلق نہیں کہی جا سکتی جنہوں نے اُردو افسانے کو افسانہ پن سے نجات دلا کر اسے تخلیقی ذائقہ سے روشناس کرایا ہے۔ قرۃ العین حیدر تخلیقی افسانے کا پہلا معتبر نام ہے جس کا افسانہ نہ صرف اپنے اندر بلکہ اپنے باہر کھلی اور نوکیلی فضا میں شکل کر کسی تہہ در تہہ نظم کی طرح نئے سے نیا منظر پیش کرتا ہے۔

محمود ہاشمی نے ساتویں دہائی کی ابتدا میں غالباً پہلی مرتبہ اُردو میں تخلیقی افسانے کی نشاندہی کی تھی۔ نئے افسانہ پر ان کے ایک حالیہ مضمون سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں:

اس تخلیق (یعنی نیا افسانہ) کو تفہیم یا ابلاغ کی منزل تک پہونچانے سے پہلے، تخلیقی ذہن اور اس کرب سے وابستہ ہونا پڑتا ہے جس میں ایسی

تخلیقات کی روح موجود ہوتی ہے۔ دوسرے شانوں پر رکھی ہوئی صلیب کی منظر کشی سے پرانا افسانہ نگار وہ قدریں، وہ تمام سماجی حقائق اور زندگی کی مسرتوں اور کلفتوں اور عظمتوں کا چہرہ پیش کر دیتا تھا جس میں صلیب کا تمام تر جبر دوسرے کردار سہتے تھے اور افسانہ نگار ان کا محض ناظر ہوتا تھا۔ ناظر بھی ایسا جو زندگی کی اعلیٰ اقدار اور اجتماعی ضوابط کے اخلاقی درس دے کر یا نتائج نکال کر خود کو معاشرے میں جبر سہنے والوں کا ہمدرد تسلیم کرا لیتا تھا۔ نئے افسانہ نگار نے اپنے عہد کی زندگی کی صلیب خود اٹھائی ہے وہ زندگی کا ناظر نہیں خود زندگی ہے وہ خود واقعہ ہے اور معروض و موضوع ہے۔

پریم چند کی افسانوی روایت سے منسلک افسانہ نگار کا رویہ صحیح معنوں میں ایک ناظر یا تماشائی کا رویہ رہا ہے۔ اپنے شخصی کردار اور ذاتی زندگی کے مصائب و مسرتوں سے دور، اس نے ہمیشہ دوسروں کے تجربات کو بیان کرنا ہی فن سمجھا ہے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پریم چند کے افسانوں کے ڈھیلے پن، کے مقابلے میں منٹو اور اس کی نسل کے چند دوسرے افسانہ نگاروں نے یہ کمال ضرور حاصل کیا کہ افسانے کو ہئیت کے اعتبار سے غزل کی طرح ایک پختہ اور ٹھوس فریم فراہم کر دیا جس میں افسانہ نگار کا کام اسی سائز کی تصویر بنا کر فٹ کرنا رہ گیا تھا۔ لیکن یہ تمام تصویریں ایسی ہیں جن کی حدود متعین ہیں جن سے ان کا باہر نکلنا یا انھیں باہر نکالنا سعیٔ لاحاصل ثابت ہوگا۔ اس کے برعکس تخلیقی افسانہ نے بلاشبہ اس فریم کو توڑا ہے اور نتیجے میں، اضافی اہمیتوں کی حامل جدید نظم کی طرح اسے کسی مخصوص دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حیثیت برگد کے اس پیڑ کی سی ہے جو جتنا اپنی پر پیچ جڑوں میں زمین کے اندر بکھرا ہوا ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اپنی لاتعداد شاخوں میں باہر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

الفاظ کے وافر استعمال کی ایک مثال میں نے پچھلے صفحات میں پیش کی ہے۔ اب آپ لفظوں کی کفایت شعاری کی ایک مثال دیکھیے:

اس اندھیرے میں میں کب سے بھٹک رہا ہوں جہاں جہاں میں جاتا ہوں۔ وہ میرے سامنے ایک دم آکھڑے ہوتے ہیں : بازار میں، گلی میں، موڑ پر، سیڑھیوں پر، ہر اس جگہ جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے۔ بجلی کے کھمبے پر برہنہ عورت کی لاش کراس کی طرح اٹھائے وہ میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے : بتاؤ اس کا قاتل کون ہے؟ اور اچانک دوسری طرف سے کالے گھوڑے پر سوار شیطانی ہنسی ہنستا ہوا وہ آجاتا ہے : بھالے کی نوک پر بچے کی لاش اچھالتا ہوا۔ وہ دونوں صدیوں سے میرے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ میں کدھر جاؤں؟ اس گھنے اندھیرے میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

اے خدا! مجھے روشنی دو۔ لیکن خدا کہاں ہے؟ اس کی لاش بھی تو مردہ گھر میں پڑی ہے۔

(مردہ گھر : دیویندر اسر)

یہاں قاتل کون ہے اور مقتول کون، افسانہ نگار نے اس کی نشان دہی نہیں کی۔ اگر قاتل اور مقتول کی نشان دہی کر دی جاتی تو وہ مخصوص کردار اپنے واضح خدوخال میں سامنے آجاتے جو وقتی طور پر قارئین کی نفرت اور ہمدردی کے مستحق ثابت ہوتے اور یوں "خدا کی موت" کے اعلان، کے باوجود افسانہ نگار مروجہ اخلاقیات کے دائرے سے خود کو باہر نہ نکال پاتا اور افسانے کی حدود بھی کسی قدر متعین ہو جاتیں۔ لیکن افسانہ نگار نے قاتل اور مقتول کو کوئی نام نہیں دیے۔ جس کے نتیجے میں جہاں افسانہ نیکی اور بدی کی روایتی کشمکش کے بیان کے آلودہ ہونے سے بچ گیا ہے وہاں اس میں تہہ در تہہ گہری معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ افسانے میں کردار بھی ہیں اور واقعات کا بیان بھی، لیکن ان کو اتنے گہرے سایوں کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے، جو دور پھیلے ہوئے نیلے پربت کی طرح بھید بھرے دکھائی دیتے ہیں۔

افسانہ کی تعریف میں اکثر یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اسے شروع سے آخر تک دلچسپ ہونا چاہیے۔ ایک پیشہ ور افسانہ نگار کا کہنا ہے کہ اس نے سیکڑوں افسانے

اس لیے نہیں پڑھے، کہ ان کے ابتدائی جملوں سے اسے ان کے غیر دلچسپ ہونے کا ثبوت مل گیا تھا۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ کسی بھی ادب پارے کی پہچان یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے پہلے جملے سے آخری جملے تک دلچسپ ہو۔ اگر محض دلچسپی کو اعلیٰ ادب پارے کی پہچان بنا دیا جائے تو گلشن نندہ یقیناً اس دور کا سب سے بڑا ادیب تسلیم کیا جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے معزز پیشہ ور افسانہ نگار اس حقیقت پر ایمان لے آنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں اب تھوڑی سی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:
افسانوں کے انتخاب سے پہلے ان تمام نمایاں افسانہ نگاروں کی ایک فہرست بنالی گئی تھی جو کرشن، بیدی اور منٹو کی نسل کے فوراً بعد سامنے آئے۔ اس کے بعد ان سب کے یہاں تخلیقی افسانے کی تلاش کا کام بڑا صبر آزما تھا بیشتر واہم، افسانہ نگار بالکل غیر اہم ثابت ہوئے کہ جنھوں نے غزل کے روایتی شاعر کی طرح 'مانگے تانگے کے تجربات کو اپنے دل کی دھڑکن بنا کر' پیش کرنے کو فن سمجھ لیا تھا۔ جو افسانہ نگار تخلیقی افسانے کے فن پر کھرے اترے، ان کے سلسلے میں یہ مشکل بھی پیش آئی کہ ان کا کون سا افسانہ شامل کیا جائے۔

ایک بات اور: زیر نظر انتخاب میں صرف ان ہندوستانی افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کیے گئے ہیں جو ساتویں دہائی کی ابتدا میں اپنی علیحدہ شناخت کا ثبوت فراہم کر چکے تھے۔ اس کے بعد جو چند نام منظر عام پر آئے ہیں، ان کے لیے یقیناً ایک الگ انتخاب کی ضرورت ہے، جو عنقریب پیش کیا جائے گا۔

——— کمار پاشی

تخلیقی افسانوں کا انتخاب

قرۃ العین حیدر

سب سے پہلے میں ربُّ الارباب اور عیسٰی ابن اللہ کی حمد و ثنا کرتی ہوں جس نے مجھے مُردوں میں سے جگایا اور اب دوبارہ روزِ محشر تک سُلانے والا ہے اور اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کا اقرار کرتی ہوں اور بخشش کی طالب ہوں۔ خدائے قدوس تو خوب واقف ہے میں لاعلم تھی کہ یہ کون سی صدی ہے، کون سا مہینہ اور دن۔ میں اپنے کھلے تابوت میں خوابیدہ تھی جب ترے کسی فرشتے کا روپہلا پر میری ہڈیوں سے ٹکرایا اور میں اٹھ بیٹھی۔ میری کھوپڑی پائینتی پڑی تھی نیچے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُٹھایا۔ اس کی گرد جھاڑی اور گردن میں فٹ کیا۔ گھُپ اندھیرا تھا۔ کھوپڑی غلط فٹ ہوئی تھی اور مجھے آگے کی بجائے پیچھے دکھائی دینے لگا۔ بمشکل اسے ٹھیک سے لگایا۔ الٰہی ربِّ کریم میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس لمحے

سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات

میری اوّلین آرزو یہ تھی کہ آئینے میں دیکھوں کیسی لگتی ہوں۔ چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس تاریک بوسیدہ زمین دوز حجرے میں سات آٹھ سنگی تابوت ہڈیوں اور کھوپڑیوں سے لبریز دیواروں سے لگے رکھے تھے۔ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں اپنے تابوت کے کنارے بیٹھی خوفِ خدا سے لرز رہی تھی کہ اچانک کھڑکی روشن ہوئی اور وہ سیلانی فرشتہ پھر نمودار ہوا۔ کہنے لگا۔ "میں اپنی تسبیح یہاں بھول گیا۔ تم کون ہو؟"

"سینٹ فلوراسابینا آف جارجیا۔"

"خدا کی برکت ہو تم پر۔" اس نے جواب دیا اور تسبیح ڈھونڈنے میں جُٹ گیا۔ کہکشاں کے

ستاروں سے بنی وہ تسبیح مجھے ایک تابوت کے پیچھے پڑی نظر آگئی۔ میں نے فوراً کہا" ضیاء گستر، پیارے فرشتے۔ اگر وہ تسبیح ڈھونڈ دوں تو مجھے کیا دو گے؟" وہ بےحد پریشان اور سراسیمہ نظر آتا تھا۔ کمسن فرشتہ تھا۔ کہنے لگا۔" مجھے سینٹ پیٹر کے دفتر میں ایک ایک دانے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ میں ایک بھلکّڑ فرشتہ ہوں۔ اسی بھلکّڑ پن کی وجہ سے مجھے ستّر ہزار برس تک ایک TRAINEE فرشتہ رہنا پڑا۔ اب جاکر مجھے اپنا ہالہ عطا کیا گیا ہے۔ اس نے فخرو مسرت سے اپنے نور کے ہالے کی طرف اشارہ کیا۔" لیکن اب میں نے اپنی تسبیح گنوادی۔"

"کیا دو گے؟"

"کیا چاہتی ہو؟"

"میں جوان سال مری تھی۔ اُنیس[19] برس کی تھی جب میرے باپ نے مجھے سُوریا کے ایک کانونٹ میں بند کردیا۔ اگلے پچیس برس میں نے خانقاہوں میں محبوس رہ کر گزارے۔ میں ذرا۔ دُنیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اچھے کپڑے پہننے کی آرزومند ہوں۔"

"میں تم کو گوشت پوست اور خون عطا کرنے کا مختار نہیں۔ ایسا صرف روزِ قیامت ہوگا۔ فقط ایک سال تک ذی رُوح رہنے کی اجازت دلوا سکتا ہوں۔ تسبیح لاؤ۔"

"پیارے کرم کار فرشتے۔ میرا خشک پنجر ایک سال تک اس اجنبی دُنیا میں تنہا کس طرح اور کہاں مارا مارا پھرے گا۔ کسی دلچسپ مُردے کو میری دوسرا اتھ کے لیے زندہ کردو۔"

"دلچسپ مُردہ کیسا ہوتا ہے؟"

"میرا مطلب ہے ——"

"اچھا۔ پہلے تسبیح لاؤ۔"

"نہیں۔ پہلے ایک اور مُردہ زندہ کرو۔ کہو قُم باذنِ عیسیٰ ——"

"جب تم خود ولیہ ہو تو کیوں نہیں ایک عدد معجزہ دکھاتیں۔"

اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔ اس کی ایک ٹیکنیکل وجہ ہے۔ کہو قُم ——"

فرشتہ دوزانو جھک کر مصروفِ دُعا ہوا۔

دفعتاً میرے پہلو کے تابوت میں کھڑکھڑاہٹ شروع ہوگئی۔ اور دوسرا ڈھانچہ اُٹھ

بیٹھا۔ فرشتے نے مجھ سے کہا۔ "صرف سال بھر کے لیے آئندہ سال یہی مہینہ یہی تاریخ اور یہی وقت ساڑھے گیارہ بجے رات —— اس کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ خدا حافظ ——"

میں نے تسبیح اٹھا کر اُسے دی اور وہ پھر سے غائب۔

زمین دوز سرداب میں اب پھر اندھیرا تھا۔ لیکن میں خوفزدہ نہیں تھی۔ دو سکتہ ڈھانچے نے تابوت میں بیٹھے بیٹھے دایاں پنجہ اس طرح بڑھا کر سرہانے کچھ ٹٹولا گویا عادتاً جاگنے کے بعد شمع جلا کر کتاب اٹھانا چاہتا ہو۔ میں نے جلدی سے اسے مخاطب کیا اور پورا واقعہ گوش گزار کیا اور اپنا نام بتایا۔ "سینٹ فلورا سابینا آف جارجیا ——"

"فادر گریگری اور بیلیائی آف جارجیا"

"خدا کی برکت ہو تم پر مقدس باپ"

"آپ ولیہ ہیں —— ؟" فادر گریگری گھبرا کر تابوت سے نکلا اور میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے چاہے لیکن لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کے گھٹنوں کی چپنیاں بے انتہا بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ میں نے خدایا تجھ سے دعا مانگی۔ کہ اے دو جہان کے مالک اگر تو نے مجھے ایک سال کے لیے یہ ESCORT عطا کیا ہے تو اسے ایک ثابت و سالم و معقول پنجر بنا دے۔ فادر گریگری فوراً اُٹھ کھڑا ہوا کھڑکی میں سے تیز سرد ہوا اندر آ کر ہماری ہڈیوں کو کاٹے ڈال رہی تھی۔ اس نے کہا "بہت سردی ہے۔ پہلے الاؤ کا انتظام کیا چاہیے۔"

"اگر کہیں چقماق مل جائے" میں بولی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ جہاں پائن کے جھنڈ سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"فادر ادھر آجاؤ۔ ورنہ زکام ہو جائے گا۔" میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ وہ آکر اپنے تابوت کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لیے اُٹھی۔ کھڑکی کا ایک پٹ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ دوسرے پٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے کے لیے باہر جھانکا۔ پہاڑی کے عین نیچے چوڑا دریا بہہ رہا تھا۔ جو کوہستان قفقاز سے نکل کر بحیرۂ اسود میں گرتا تھا۔ مجھے یاد آگیا میں اس پہاڑی والی خانقاہ میں کئی برس رہ چکی تھی پھر اس دریا پر ایک شاندار چہار منزلہ سفید رنگ کا جگمگاتا محل نمودار ہوا۔ اور ایک مہیب آواز —— صورِ اسرافیل —— میں فوراً سجدے میں گر گئی۔

اور بہت افسوس ہوا کہ دنیا میں سال بھر رہنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ دوبارہ صورِ اسرافیل ——

سہ بارہ ——— تب فادر گریگری کھڑکی میں آیا۔ اور باہر جھانک کر مجھ سے کہا۔
"مقدس ولیہ ——— یہ ایک دخانی جہاز ہے۔ اور اپنا سائرن بجاتا ہے۔ اٹھو"
میں کھڑی ہوگئی اور باہر جھانکا۔ نیچے دریا کے کنارے ایک خیمہ گاہ نظر آئی جس میں جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور ساز بجائے جا رہے تھے اور ہنسی اور قہقہوں کا شور۔ خداوندا میرا جی چاہا کہ میں بھی جا کر اس جشن میں شامل ہو جاؤں۔ تب فادر کی آواز نے مجھے چونکایا جو کہہ رہا تھا "آؤ باہر چل کر آگ تلاش کریں۔"

ہم دونوں ٹٹولتے ٹٹولتے اس سرداب سے نکل کر ایک سرنگ میں پہنچے جس کی سیڑھیاں اوپر باغ میں کھلتی تھیں۔ دروازے پر جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ڈیزی کے تختے لہلہا رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، گُرنٹے کی جھاڑیاں پھلانگتے، باغ میں آئے جس کے سامنے ایک بڑا چرچ استادہ تھا اور اوک اور پائن کے جھرمٹ۔ ایک درخت کے نیچے کاغذی پلیٹیں گلاس اور نیپکن پڑے نظر آئے۔ میں لکڑیاں چننے لگی۔ فادر نے اس کاٹ کباڑ کو اکٹھا کیا۔ ایک ڈبیا ملی اس میں تیلیاں سی تھیں۔ فادر نے ایک تیلی ڈبیا پر رگڑی۔ آگ پیدا ہوئی۔ فادر نے کہا۔ "یہ ماچس ہے۔ کوئی پکنک منانے والی ٹولی یہاں چھوڑ گئی۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

ہم نے الاؤ جلا کر تاپنا شروع کیا۔

خدایا۔ میں چغلی نہیں کھاتی مگر ولی شمعون کی قسم۔ اس لمحے میں نے دیکھا کہ فادر گریگری اور ہیلیانی کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا ہے۔ میں بے طرح گھبرائی۔ دھویں کے مرغولوں کے پیچھے ایک ننھا سا انگارہ اس کے منہ میں روشن تھا۔ الٰہی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دھواں اور آگ کی لپٹیں صرف اخوان الشیاطین کے منہ سے نکلتی ہیں۔ میں نے فوراً تیری صلیب کا نشان بنایا اور سوچا کہ یقیناً کوئی بدروح اس کے پنجر میں آگھسی ہے۔ یا بھلکڑ فرشتے کی غلطی ہے جس نے کسی عابد و زاہد کے بجائے کسی خبیث ———

اچانک فادر ہنسنے لگا اور بولا۔ "ڈرومت۔ یہ سگریٹ کہلاتا ہے۔ جو سیاح یہاں پکنک کے لیے آئے تھے ماچس کے ساتھ ایک پیکٹ سگریٹ بھی یہاں بھول گئے۔ مجھے ابھی پتوں میں پڑا ملا۔"

میں نے کہا۔ "تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ شے سگریٹ کہلاتی ہے اور اسے جلا کر

منہ سے دُھواں اُگلتے ہیں۔ یہ صریحاً ایک طاغوتی، ابلیسی فعل ہے ـــــ"

فادر نے نرمی سے سمجھایا۔ "بی بی فلورا ـــــ امریکن سائنسدانوں نے حال ہی میں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جسے رات کو سرہانے فٹ کر کے انسان سو جاتا ہے اور سوتے میں اس آلے کے ذریعے مختلف عُلوم ذہن نشین کر لیتا ہے۔ تو کیا تم اس قادرِ مطلق کی قدرت میں شک کر سکتی ہو جس نے ساڑھے تیرہ سو برس کی طویل نیند کے دوران اس مُردادے میں مجھے آج تک کے متعدد علوم اور جدید زبانوں اور دیگر معاملات سے آگاہ کر دیا۔ ایک حد تک تم خود بہت سی باتوں سے واقف ہو چکی ہو۔ اس کا تجربہ تمھیں اس ایک برس میں خود ہو جائے گا بلکہ ابھی ابھی اسی لمحے سے ہو جاتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سُنو۔"

نیچے وادی میں جو ساز بج رہے تھے میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ گٹار، بیلالیکا، اکارڈین اور سیکسوفون کہلاتے ہیں اور وہ نوجوان رُوسی اور چار جین زبانوں کے گیت گا رہے تھے۔

پھر ہوا کے ریلے کے ساتھ وادی کی آوازیں ہمارے کانوں میں پہنچیں۔ نیچے خیمہ گاہ میں ایک نوجوان گٹار بجاتے بجاتے ایک لڑکی سے کہہ رہا تھا ـــــ "نتاشا! دیکھو اوپر بھی الاؤ جل رہا ہے۔ کچھ لوگ وہاں پہلے سے کیمپنگ کر رہے ہیں۔" پھر ہوا کا رُخ بدل گیا اور وہ آوازیں مدھم پڑ گئیں۔

تب فادر نے کہا "مقدس ولیہ ـــــ"

"اگر تم مجھے اس لقب سے مخاطب نہ کرو تو بہتر ہو گا۔ اس کی وجہ ابھی بتا دوں گی۔"

"کیا وجہ ہے؟ اچھا ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو سال بھر اکٹھے رہنا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اپنا اپنا احوال ایک دوسرے کو بلا کم و کاست بتا دیا جائے۔ تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ میں گرینڈ ڈیوک آف طفلس کا بیٹا تمھاری خدمت میں حاضر ہوں۔"

الٰہی! میں ONE - UPMANSHIP نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن لامحالہ مجبوراً ابتلانا پڑا کہ میرے والد سفیر باز نطیم برائے ایران ہیں۔

"تھے ـــــ" اس نے تصحیح کی "قسطنطنیہ سے شمالی گرجستان کے اس دُور افتادہ پہاڑ پر کیسے آ پہنچیں ـــــ"

"ہم جب باسفورس سے چلے" میں نے کہنا شروع کیا۔ "سمندر پُر سکون تھا اور ہوا سازگار ـــــ"

"لیکن باسفورس سے ایران جانے کے لیے بحیرۂ اسود کا رُخ کیوں ـــــ؟ تمھارے جہاز کا کپتان پاگل تھا ـــــ؟"

فادر گریگری نے سگریٹ کا کش لگا کر میری بات کاٹی۔

"نہیں، سنو تو، اچھا شروع سے بتاتی ہوں۔ تمھیں تو معلوم ہوگا۔ ہم بازنطینی کتنے شاندار لوگ تھے۔ قسطنطنیہ سرکاری طور پر رُوم ثانی کہلاتا تھا۔ جسٹینین نے کلیسائے سانتا صوفیہ تعمیر کرنے کے بعد کہا تھا ـــــ خداوندا ـــــ میں تیرے بادشاہ سلیمانؑ سے بازی لے گیا ـــــ جسٹینین، تھیوسوڈیس اور آرکیڈیس کے دور کے علوم و فنون، اولمپک کھیل ـــــ اور ہمارا لاثانی آرٹ ـــــ"

"تھیوڈورا کو گول کر گئیں ـــــ!"، فادر نے چوٹ کی۔

"خیر وہ بھی تھی ـــــ ایک کلوپٹرا ایک تھیوڈورا ـــــ ان دو نے ذرا علو ہمتی دکھائی تو وہ تم مردوں کے حلق سے آج تک نہ اتریں۔ خیر جب ساسانیوں نے زور پکڑا اور ہمارے صوبہ شام پر قبضہ کر کے یروشلم سے خداوند کا اصلی صلیب اٹھا کر طیسفون لے گئے ہمارا ہرکلیس ان سے لڑ بھڑ اسے یروشلم لے آیا ـــــ جب عربوں نے یروشلم فتح کیا تو وہ صلیب ہمارا ہرکلیس قسطنطنیہ لے آیا۔"

"طبلسی میں میں نے بھی اپنے والد کے ساتھ عرب لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر ناکام۔ وہ دنیا کی نئی عالمگیر طاقت تھے ـــــ جیسے آج کل روس اور امریکہ ـــــ فادر اور ریلیانی نے خشکی سے کہا۔

"ہم بازنطینی ریشہ دوانیوں کے بے حد شائق تھے اور ہمارے دربار کی سازشیں سیاسی قتل، شہزادیوں کے معاشقے، شہزادوں کے اسکینڈل، ساری دُنیا میں مشہور تھے۔ عام دستور یہ تھا کہ ہمارے بادشاہوں کو ان کی ملکائیں یا بیٹے زہر دے کر مار ڈالتے تھے۔ کلیسا کا حکومت پر گہرا دباؤ تھا۔ مگر پادری لوگ خود آپس میں مذہبی مسائل میں بال کی کھال نکال کر سب وقت برباد کر رہے تھے۔ میرے والد اسٹیفن ہونوریس حکومت کے ایک اہم وزیر تھے، والدہ آئرینا ماریا ملکہ کی خاص لیڈی۔ اِن ویٹنگ۔ بڑا بھائی الگزینڈر سلویریس شاہی دستے کا افسر اعلیٰ ہم لوگ بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ سارا کنبہ درباری سازشوں میں مشغول بڑے مزے سے گزرتی تھی۔ تھیٹر۔ اولمپک کھیل۔ گلیڈی ایٹرز کے مقابلے۔ ہمارے پڑوسی سر جیس پیلا گیس

ابا کے گہرے دوست تھے۔ سالونیکا میں ان کے تاکستان تھے۔ بحیرۂ اسود میں اپنے تجارتی جہاز چلتے تھے۔ ان کے لڑکے تھیوڈورک گیلاس سے میری شادی ہونے والی تھی۔ وہ بے حد شکیل اور ہوش مند تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ میں بازنطیم ہائی سوسائٹی کی اس انتہائی کرپٹ زندگی میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ شادی کے بعد میرے ساتھ سالونیکا چل کر رہو۔ آرام سے اپنے تاکستان میں بیٹھ کر میں فلسفہ پڑھا کروں گا تم بربط بجانا اور کشیدہ کاری کرنا لیکن فادر میں اس ہائی لائف کی از حد شوقین تھی۔ روز شام کو والدین کے ساتھ درباری تقریبات میں جاتی۔ رقص کرتی۔ ایک سے ایک بڑھیا پوشاکیں پہنتی۔ اس وقت میری عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ گلیڈی ایٹرز کے تماشوں پر میں جتنی عاشق تھی۔ تھیوڈورک ان سے اتنا ہی متنفّر تھا۔ کہتا ہم لوگ عیسائی ہوگئے۔ مگر رومنوں کو ان بے رحم وحشیانہ کھیل تماشوں کا شوق نہیں گیا۔ خود گلیڈی ایٹرز کے تماشائی دو مخالف فریقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ سبز پوش اور کبود پوش کہلاتے تھے اور ایک دوسرے سے کٹے مرتے تھے۔ میرے تینوں بھائی سبز پوش پارٹی میں شامل تھے۔

"ہماری شادی سینٹ صوفیہ کے کلیسا میں بڑی دھوم دھام سے ہونے والی تھی۔ شہنشاہ میلر گوڈ فادر تھا۔ مہینوں پہلے سے میرے کپڑے سیے جا رہے تھے۔ بہترین زیورات تیار کیے گئے تھے۔ شادی سے چند دن قبل تھیوڈورک کے والد نے یہ خوشخبری سنائی کہ قیصر نے شادی کے تحفے کے طور پر تھیوڈورک کو اپنا صاحبِ خاص مقرر کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی تھیوڈورک گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی جہیز کی ایک TAPESTRY میں آخری ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ غضب ہوگیا۔ میں اور قیصر کا حاجب؟ میں رات ہی کو بندرگاہ جا کر گال روانہ ہونے کا انتظام کرتا ہوں شادی کے فوراً بعد میرے ساتھ چپکے سے نکل چلنا ——— فادر ——— اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ تھیوڈورک ان نوجوانوں میں سے تھا جنھیں AGNOSTIC اور "باغی" کہا جاتا ہے۔

"فادر۔ میں ماں باپ اور بھائیوں کی لاڈلی اور بے حد ضدی لڑکی تھی۔ میں نے کہا وحشیوں کے ملک جاتی ہے میری پاپوش، میں تو یہیں رہوں گی اور تمھیں بھی یہیں رہنا ہوگا اس نے کہا سنو۔ مجھے تمھارے شہنشاہ، اس کے خاندان، لاٹ پادری، ساری بازنطینی حکومت سے نفرت ہے۔ میں اور اس دربار کی ملازمت کروں؟ ناممکن، ہم دونوں میں کافی تکرار ہوئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باغ کی دیوار پھلانگ کر اپنے گھر چلا گیا۔

"فادر- اب خالص بازنطینی روایات کے مطابق میری والدہ کی ایک کنیز حریری پردے کے پیچھے چھپی یہ سارا مکالمہ سن رہی تھی- وہ بلغاری کنیز بھی دراصل حکومت کی جاسوسہ تھی اس نے جاکر سارا قصہ بادشاہ سے جڑ دیا- دوسرے دن تھیوڈورک کو گرفتار کرنے کا حکم خاص میرے بھائی الگزنڈر سلوپریس ہی کو دیا گیا- ساتھ ہی یہ تاکید کہ تھیوڈورک کو شراب میں زہر ملا کر پلا دیا جائے- میرا بھائی شاہی حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا- ورنہ اس کو بھی قتل کر دیا جاتا- تب میں اسی رات کلوک اوڑھ، خنجر اور اشرفیوں کی تھیلی قباچے میں چھپا، تھیوڈورک کے مکان پر پہنچی- اس کے باغ کی دیوار کے عین نیچے سمندر تھا اور ہم لوگ عموماً یہیں ملا کرتے تھے تھیوڈورک کو اس حکم کی اطلاع نہیں تھی، وہ خوش خوش گلاب کی کیاری پھلانگتا دیوار پر آیا- میں نے اسے اس منحوس خبر سے آگاہ کیا- وہ ہونچکا رہ گیا- میں نے کہا میں اپنی حماقت اور غلطی پر نادم ہوں- اب ساتھ چلنے کو تیار ہوں آؤ فوراً بھاگ چلیں ورنہ صبح ہوتے ہی میرا بھائی تمھیں گرفتار کرلے گا- فادر- جانتے ہو تھیوڈورک نے کیا کہا؟ وہ دیوار پر سے کود کر سمندر کے رُخ کھڑا ہو گیا- بازو پھیلائے اور بولا ——— اے زر پرست، عیش پسند بازنطینی، رُمیں زادی ——— اِس چال سے مجھے ابھی پکڑوانے آئی ——— ؟ خدا حافظ ———" اور پانی میں کود گیا-

"میں ہکا بکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی- اس وقت، حالانکہ میں کم عمر اور کم عقل تھی مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ ایک فاسد، فسق پذیر معاشرے میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان کا انسان پر سے اعتبار مکمل طور پر اُٹھ جاتا ہے- میں تھیوڈورک کے ساتھ اپنی جان پر کھیل کر بھاگنے کے لیے تیار تھی- ہم لوگ بلغاریہ جاسکتے تھے- کارپیتھین پہاڑوں میں چھپ سکتے تھے- کہیں بھی جاسکتے تھے- لیکن اس نے مجھ پر بھی شک کیا ——— اور تنہا غائب ہو گیا-

"بعد میں سُنا گیا کہ وہ گال پہنچا وہاں سے برطانیہ- وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلا- خدا کرے اسے برطانوی وحشی کھا گئے ہوں ———" میں نے آنسو پونچھے- فادر گریگری نے نرمی سے کہا:

"بی بی فلورا اسابینا- برطانوی نیم وحشی ہیں- آدم خور نہیں- پھر کیا ہوا؟

"خدا کا شکر ہے کہ والد پر عتاب قیصری نازل نہ ہوا- مگر حکم ملا کہ جلد از جلد قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر ٹیسیفون میں سفارت خانے کا چارج لیں- یہ بھی ایک قسم کی سزا تھی- کیونکہ شہنشاہ جانتا تھا کہ مدائن پر عنقریب عربوں کی وجہ سے آفت آنے والی ہے- اس میں ہم سب مارے جائیں گے- چنانچہ چند روز بعد ہمارے کنبے نے جہاز پر سوار ہو کر بحیرۂ روم کا رُخ

کیا۔ سمندر پرسکون تھا اور ہوا سازگار ——

"جہاز انطاکیہ کے کنارے میں لنگر انداز ہوا۔ ہم لوگ بندرگاہ کی مرمریں سیڑھیاں چڑھے۔ شہر کے میوزیم میں ملکۂ مصر کا مرمریں پورٹریٹ دیکھا جو ایک رومن سنگتراش نے کلوپٹرا کو اپنے سامنے بٹھا کر بنایا تھا۔ سچ کہتی ہوں فادر۔ اور میں ہرگز CATTY نہیں ہوں۔ مگر کلوپٹرا قطعی حسین نہ تھی۔ نہ جانے اسے اس قدر خوبصورت کیوں مشہور کر دیا گیا ہے۔ خاصی موٹی بھدی ناک۔ اوپر کا ہونٹ موٹا۔ نیچے کا پتلا۔ مردانہ کرخت چہرہ، اسے وجیہہ اور قبول صورت ضرور کہہ سکتے ہیں۔ پری جمال ہرگز نہیں ——

ہم لوگ انطاکیہ سے CYRRHUS، وہاں سے ایڈیسہ اور نسی بس (NISI BUS) کے راستے مدائن پہنچے۔ دجلہ کے کنارے جہاں والد نے چند روز بعد قصرِ خسروی میں سفارتی کاغذات شاہ دارا حشم کو پیش کیے۔ وہ تھا تو سائرس و دارا کا جانشین۔ مگر اب تک یہ لوگ بھی ہماری طرح بیحد ڈیکیڈنٹ ہو چکے تھے۔ یہاں بھی قسطنطنیہ کی طرح درباری سازشوں اور شاہی خاندان میں ایک دوسرے کے قتل خون کا بازار گرم تھا۔ اور عیش و عشرت کی فراوانی، شاہ کی گلشن سرائے میں روز جشن منعقد ہوتے۔

تیسفون میں ایک رومن جنرل گرویدہ ہوا۔ لیکن وہ کمینہ تھا۔ ہم لوگ گریگ اور یتھوڈوکس۔ آبا اس سے شادی کے لیے راضی نہ ہوئے حالانکہ میں تیار تھی۔ قسطنطنیہ میں میں نے سنا تھا کہ عجمی گھنگھریالے داڑھیوں والے خشمناک آتش پرست اپنی عورتوں کو پردے میں مقید رکھتے ہیں اور بہت وحشی لوگ ہیں۔ مگر وہ ہم بازنطینیوں سے بڑھ چڑھ کر مہذب، پُرتکلف اور خوش ذوق نکلے۔ اور ہماری طرح خوش شکل اور وہ —— موبدانِ موبد کا فرزند —— دستور زادہ منوچہر پیروز ——" میں کچھ یاد کر کے اُداس ہو گئی۔ فادر گریگری نے کنفشن سننے والی آواز میں کہا "بی بی کہے جاؤ۔ میں سُن رہا ہوں۔"

" فادر منوچہر —— واقعی منوچہر تھا۔ اور اس نے میرے نام کا ترجمہ اپنی زبان میں گُل بانو کیا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا —— گُل بانو —— گول چہرے —— غونچے —— گول بدون بپیغمبر مہ آباد کی قسم —— تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں دجلہ میں کود کر جان دے دوں گا۔ چلو ہم لوگ آتش بہرام کی گواہی میں چپکے سے بیاہ کر لیں۔ میں راضی ہو گئی۔ اس شام ہم دجلہ کے کنارے ایک کنج میں بیٹھے یہ اسکیم بنا رہے تھے۔ شومئ قسمت۔ شاید یہاں ایک ساسانی جاسوس گلبن میں چھپا بیٹھا تھا۔ یا کیا۔ بجرے پہ سوار ہو کر شام کو جب میں اپنے مکان پہنچی مجھے

فوراً میری غنودگاہ میں مقفل کر دیا گیا۔ میں کبھی کمبخت تھیوڈورک کو یاد کرکے روتی کبھی رومن جنرل لوسی لیس اگنیشس کو اور کبھی دستورزادہ منوچہر پیروزکو ——— تیسرے روز صبح والدہ سرخ آنکھیں لیے کمرے میں آئیں اور کہا بیٹی سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں سمجھی شاید بازنطیم واپس جاتے ہیں۔ فوراً عرق گلاب سے منہ دھویا۔ گرمابہ میں جا کر نہائی، کپڑے بدلے۔ باہر آئی۔ لیکن مجھے دیکھ کر سب گھر والے بالکل خاموش۔ بلغاری غلام اور کنیزیں بھی، کچھ پتہ نہ چلا کہاں جا رہے ہیں۔ شاید سمندر میں ڈبونے کو لیے جاتے ہوں۔ ابا اپنی سخت گیری اور سنگدلی کے لیے مشہور تھے۔ میں تھر تھر کانپتی دروازے سے نکلی۔ والدہ مجھ سے لپٹ کر خوب روئیں۔ مگر وہ بھی خاموش۔ کنیزوں نے مجھے کجاوے میں سوار کرا دیا۔ اونٹنی ہل جل کر اٹھی میں سمجھی زلزلہ آ گیا۔ چلنے لگی ——— ڈر لگا کہ اب گری کہ گری۔ والد اور دونوں بھائی تازی گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ روز بانوں نے وہ چوبی صندوق جن میں میرے جہیز کا زروجواہر اور طلائی اور نقرئی ظروف قسطنطنیہ سے ساتھ آئے تھے رواحل پر لادے۔ والدہ دروازے میں کھڑی روتی رہیں۔ کارواں روانہ ہوا۔ تیسفون کی شہر پناہ سے نکل کر شام کا رُخ کیا۔ دمشق پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں فرودگاہوں میں قیام کیا والد اور بھائی چُپ۔ مجھے اب اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ ایک کافر مجوسی سے عشق کی سزا والد کے نزدیک موت سے کم تو کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔

دمشق سے کافی دُور جا کر ایک راس الجبل پر زیتون کے درختوں میں چھپی ایک گریک اور تھوڈوکس خانقاہ نظر آئی۔ اس کے پھاٹک پر پہنچ کر قافلہ رُکا۔ ابا نے گھوڑے سے اتر کر خانقاہ کے گھنٹے کا رسّہ تین مرتبہ ہلایا۔ کچھ دیر بعد مہیب چوبی پھاٹک چرچراتا ہوا کھلا اور ایک یونانی تارکُ الدنیا ضعیفہ نے جھانکا۔ چند منٹ بعد دوسری یونانی ضعیفہ ہم لوگوں کو اندر لے گئی۔ ایک بڑے کمرے میں سرد بھورے پتھروں کا فرش۔ سرد پتھریلی دیواریں۔ دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی۔ دو کھُردری بنچیں۔ یہ ضعیفہ خانقاہ کی ایبس اور پہلے ایک بازنطینی شہزادی تھی۔ دوسرے کمرے میں جا کر والد نے اس سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ پھر مجھے بلایا اور اتنے دنوں بعد پہلی مرتبہ بولے۔ کہنے لگے "دیکھو بیٹی۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ میں تمھیں ہمیشہ کے لیے خداوند یسوع کی پناہ اور امان میں دے دوں۔"

"جی۔ ابا" میں نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

والد دوسرے کمرے میں آئے۔ رُوز بانوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے اشرفیوں وغیرہ سے

بربر صندوق مدرسیپریر کے سامنے رکھے۔ جو ابّا نے دستور کے مطابق بطور میرے "آسمانی جہیز" خانقاہ کی نذر کیے۔ اس کے بعد آبا نے مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ آنسو ضبط کیے۔ بھائیوں نے بھی اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی۔ اب میں یسوع کی دلہن بننے والی تھی۔ وہ تینوں، میرا باپ اور میرا بھائی میرے سامنے احتراماً دوزانو جھکے۔ اور کہا۔ "ہمارے لیے دعا کرنا۔" اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میرا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ ہمت سے کام لے کر سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ تینوں پھاٹک سے نکلے۔ گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سر جھکائے پہاڑی راستے پر اُتر گئے۔ اور رات کے دھندلکے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے وہ کوتل اونٹ۔ ایک پر خالی محمل دوسرے پر باربرداری کے شتر جو میرے سابقہ دنیاوی جہیز کا مال متاع میرے مستقبل کی رُوحانی جائے پناہ میں لے کر آئے تھے اب خالی واپس جا رہے تھے۔ یونانی ضعیفہ نے باہر جا کر پھاٹک میں تالہ چڑھا دیا اور کنجیوں کا گچھا جھنجھناتی شمع ہاتھ میں لیے واپس آئی اور کہا۔۔۔۔ "چلو۔۔۔۔" میں ایک تاریک سرد گیلری میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ ایک حجرے میں داخل ہوئی۔ سرد پتھریلی دیواریں سرد فرش۔ ایک چھوٹی سی سلاخوں دار کھڑکی۔ مسہری کی بجائے چوبی تختہ جس پر بکری کی اون کا گلیم بچھا تھا۔ اس پر بھیڑ کی اُون کا کھردرا لبادہ میرے لیے تیار رکھا تھا ایک تسبیح سیاہ سرہانے ایک شمعدان دیوار پر سیاہ صلیب اور موزیک کا ایک چھوٹا سا بازنطینی آئیکن۔ تپائی پر ایک سنگی پیالہ، ایک رکابی، لکڑی کا ایک چمچہ۔ بوڑھی راہبہ گیلری میں چلی گئی۔ میں نے مرواریدسے مرصع ارغوانی طاس کا قباچہ اتارا۔ کھردری ردا پہنی۔ قباچے کا بنڈل بنا کر راہبہ کو تھما دیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے یسوع کے آئیکن کے سامنے دوزانو جھک گئی۔"

میں نے بات ختم کی۔ فادر اس اثنا میں سگرٹوں کا آدھا پیکٹ پھونک چکا تھا۔

"اس کے بعد۔۔۔۔؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا۔ ہمارا شہنشاہ ہرکلیس مستقل عربوں سے جا بھڑتا اور بُری طرح ہار جاتا تھا۔ ہمارے چند بزرگ پادریوں کا کہنا تھا کہ ہم لوگ اس قدر گمراہ اور گنہ گار ہو چکے ہیں کہ خدا ہم سے خفا ہے۔ ہمارے پیدا ہونے سے چند سال قبل ہی وہ لرزہ خیز واقعہ ہوا تھا جب صحرائے عرب سے نکل کر دو فقیر نما ایلچی ایک بے انتہا اہم مراسلہ کر شاہ ایران کے پاس آئے تھے۔ جس طرح کا مراسلہ ایسے ہی درویش نما ایلچی ہمارے قیصر کے پاس لائے تھے۔ اور جیسا

تحقیر آمیز سلوک اس نے ان کے ساتھ کیا تھا اسی طرح شہنشاہ خسرو پرویز نے استہزا کے ساتھ وہ خط پڑھا اور ایلچیوں کو دربار سے نکال دیا۔ اس کے چند برس بعد ہی دولت ساسانیہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو گئی۔ جب ہم لوگ مدائن میں تھے وہ شاہ خسرو کے آخری جانشین کا دور تھا۔ وہ اب بھی اپنی طلائی کرسی پر پردے کے پیچھے اکڑا ہوا بیٹھا رہتا تھا۔

"خانقاہ میں محبوس، بیرونی دنیا سے میرا مکمل قطع تعلق ہو چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد دمشق سے آنے والے چند پادری یہ خبر لائے کہ شاہ نے جوش کر کچھ عرصے سے عربوں کے خلاف کلدانیہ بھیج رکھا تھا اس کے جوابی حملے میں کیلف کی فوجوں نے تیسفون ہی کا صفایا کر دیا۔ آپا اس جنگ سے ذرا قبل قسطنطنیہ واپس بلا لیے گئے تھے۔ شام و مصر ہمارے ہاتھوں سے نکلے۔ ایران آلِ ساسان نے کھویا۔ مجھے آپا کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ اور تینوں جوان فوجی بھائی۔ جانے اب ان کو کس کشتی گاہ میں بھیجدیا جائے۔ میں صبح شام دعائیں مانگا کرتی۔ عبادت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

"لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نئی حکومت نے ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ سنا گیا وہ کہتے تھے کہ وہ اپنے پروفٹ کے اس چارٹر پر عمل کر رہے ہیں جو انھوں نے خانقاہ سینٹ کیتھرین کے راہبوں کو دیا تھا۔

"غروب آفتاب کے بعد جب ہم میں سے کوئی راہبہ برجی کے چل چراغ میں قندیل روشن کرنے کے لیے اوپر جاتی تو لبنان اور فلسطین اور مصر کی سمت جانے والے کارواں گھنٹیاں بجاتے اپنے اپنے حُدی خوانوں کی قیادت میں پہاڑی راستے پر سے گزرتے نظر آتے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی آواز دیتا —— بنی عیسیٰ روح اللہ کی اُمت والیو تم پر سلامتی ہو۔ جواباً ہم دیر تک قندیل اُٹھائے برجی میں کھڑے رہتے یہاں تک وہ ابن السبیل دھندلکے میں کھو جاتے۔

"دمشق اور یروشلم کی عیسائی امیرزادیاں اپنی خواصوں اور غلاموں کے ساتھ ہمارے عیسیٰ کدے میں مدفون ولی شمعون کے مزار پر بیش قیمت چادریں[1] چڑھانے آتیں اور میں بڑے رشک سے ان کی زرق برق پوشاکیں دیکھا کرتی۔

---

[1] اولیا کے مزاروں پر چادریں EPITHAPION چڑھانے کی رسم مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ کے عیسائیوں سے سیکھی۔ (ق، ح)

"ایک صبح میں چھت پر کبوتروں کو دانہ کھلا رہی تھی جب دُور سے ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ آگے آگے سفید گھوڑے پر ایک شہزادی سوار تھی۔ باقاعدہ سنہرا تاج سر پہ بائیں ہاتھ میں سینٹ جارج کا پرچم۔ گورنمنٹ کے دو عرب افسر گھوڑوں پر سوار اس کے دائیں بائیں آ رہے تھے۔ میں نے حیرت سے سوچا کس ملک کی ملکہ ہے —— وہ گرجستان کی شہزادی کاتنکا تناتن تھی۔"

جُوں ہی میں نے یہ نام لیا فادر گریگیری چونک پڑا اور جلدی جلدی سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ میں نے قصّہ جاری رکھا۔

"وہ اتنی دُور دراز کی مسافت طے کر کے ولی شمعون کے مزار کی زیارت کرنے آئی تھی۔ امیرالمومنین کے افسروں نے اس کو خانقاہ تک احترام سے پہنچایا۔ بڑی البیلی شاندار، منچلی شہزادی تھی جو بانکے مسلمان شہسوار اسے پھاٹک تک چھوڑنے آئے تھے اُن سے اتنی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی کہ ہم لوگ جو اس کے استقبال کے لیے نکلے تھے کھڑے کھڑے تھک گئے۔

"ہم چار راہبات اس کی میزبانی پر مامور کی گئیں۔ شہزادی ہمارے ہاں ایک ماہ مہمان رہی۔ خانقاہ اور گرجا کو زر و جواہر نذر کیا۔ ولی کے مزار پر مشجر زربفت کی چادر چڑھائی جس کے کناروں پر یاقوت اور زمرّد سے گلِ صنوبر کی بیل بنائی گئی تھی۔

"چلتے وقت شہزادی نے ہماری ایبس سے درخواست کی کہ اس نے اپنی ریاست میں ایک نئی خانقاہ اور پرستش گاہ تعمیر کی ہے اس کی دیکھ بھال کے لیے چند تجربہ کار راہبات کو اس کے ساتھ بھیج دیں۔ ایبس نے مجھے اور تین لڑکیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے ساتھ جارجیا روانہ ہوں۔ میں بخوشی تیار ہو گئی۔ باقی راہبات میں سے دو تو راستے میں ہی مر گئیں۔ وہ دونوں بے چاریاں قبطی لڑکیاں تھیں، راستے میں پہاڑوں کی شدید سردی برداشت نہ کر سکیں۔ تیسری لڑکی یونانی تھی۔ اس کے باپ نے اسے بھی زبردستی خانقاہ میں ٹھونس دیا تھا۔ وہ طربزون کے قریب قافلے سے بچھڑ گئی اور کہنے والے کہتے ہیں کسی عرب یا بازنطینی تاجر کے ساتھ بھاگ گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

"اسی شہزادی نے اس پہاڑی پہ یہ رباط تعمیر کروایا تھا۔ یہ سامنے والا گرجا بہت بعد میں بنا ہو گا۔ میں مرتے دم تک یہاں رہی۔ اکثر مجھے اپنے گھر والوں کی یاد آئی اور فکر ستاتی بازنطیم سے جارجیا تاجر اور پادری مستقل آیا جایا کرتے تھے۔ ان سے وہاں کی خبریں معلوم ہوتی رہتیں۔ ضوابط کے مطابق میں اپنے ماں باپ سے خط و کتابت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب وہ سب

میرے لیے اجنبی تھے۔ میرا رشتہ صرف خدا سے تھا۔ بازنطیم سے آنے والے پادری بتایا کرتے :
قسطنطین دوئم کو اس کے بیٹے تھیوڈوسس نے قتل کیا۔ پھر اس کے بیٹے قسطنطین پوگونے
ٹس نے اپنے بھائیوں ہرقل اور ٹائی بیریس کی ناکیں ہی کاٹ ڈالیں چھری سے۔ اور بے شمار
پادری مصلوب کیے گئے۔ پھر ایک خانہ بر انداز نے جو یہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں، باتوں باتوں
میں ذکر کیا کہ پچھلی خانہ جنگی میں جو قتل عام ہوا اس میں وزیر اسٹیفن ہونوریس اور اس کے
تینوں بیٹے ہلاک ہوئے۔ لیڈی آئرینا ماریہ بہت پہلے قضائے الٰہی سے گزر چکیں۔

"اس رات میں اپنے حجرے میں رات بھر بلک بلک کر مسلسل زار و قطار روئی۔
برف کے پانی سے آنکھیں دھو کر فجر کی عبادت میں شامل ہوئی۔ اس کے بعد میں نے شبستان اور
گلکدے کے درختوں، پھول پتّوں، چرندوں، پرندوں، تیتریوں سے بھی اپنا دل ہٹا لیا کہ یہ
سب مظاہر قدرت کسی نہ کسی طور سے دل کو راحت بخشتے تھے۔ اور مسرّت کی علامت تھے۔ محض
الم ——— خالص اندوہ اور کرب میرا حصّہ تھے۔ اور وہ مجھے پوری طرح ملا۔ میں گھنٹوں سجدے
میں پڑی رہتی۔ مسلسل روزے رکھتی۔ ٹاٹ اوڑھ کر سر پر راکھ ڈال کر اپنے پچھلے کردہ اور ناکردہ
دانستہ اور نادانستہ گناہوں کی معافی چاہتی۔ لیکن فادر گریگری۔ ہم یونانیوں کے ہاں جو
کتھارسس کا تصوّر ہے وہ بالکل لغو ہے۔ کتھارسس کوئی چیز نہیں۔ کرب بہم ہے۔ خداوندِ
مسیح کا صلیب پر سہا ہوا کرب حقیقت کی بنیادی حقیقت ہے۔

"اب میرے زہد و تقویٰ، حلم و مسکینی و فروتنی کی شہرت کوہستان قفقاز میں دُور
دُور تک پھیل گئی۔ لوگ میرے پاس دعا درود کے لیے آنے لگے۔ اتفاق اور خدا کی رحمت
سے ایسا ہوا کہ بہت سے مریضوں کے لیے میں نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ اپاہج اور بوڑھے
ڈولیوں میں بیٹھ بیٹھ کر میرے پاس آنے لگے۔ پھر ایک چھوت لگنے والی خطرناک بیماری کا مریض
آیا۔ میں نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ وہ تو اچھا ہو گیا میں اسی مرض میں
مبتلا ہو کر مر گئی۔ اب مجھے یاد نہیں وہ کیا مرض تھا۔ مرتے وقت میری عمر ۴۵ برس کی تھی۔
میرا تابوت دستور کے مطابق اسی خانقاہ کے تہ خانہ میں رکھ دیا گیا۔

"بہت حسین تھیں؟"

"بےحد۔"

"میں بھی۔"

اِس وقت خدایا۔ معاف کرنا میرے دل میں ایک خیال آیا —— یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش، جب یہ زندہ تھا اور فادر نہیں بنا تھا اور یہ گرینڈ ڈیوک آف طبلیسی کا بیٹا تھا اور میں سفیر بازنطیم کی حُورلقا لڑکی۔ اس وقت اگر ہماری ملاقات ہوتی —— مگر تیری مصلحتیں تو ہی جانے —— میں نے فادر کو اپنے قصّے کے انجام سے آگاہ کیا۔ " میرے مرنے کے بعد زائرین یہاں آنے لگے۔ چند معجزے مشہور ہو گئے۔ صدیاں گزرتی گئیں ۱۸۷۳ء میں کلیسا نے فیصلہ کیا کہ کسی برگزیدہ بندے یا بندی کو سینٹ قرار دینے کے لیے درجۂ ولایت کی جن شرائط کو پورا کرنا لازم ہے مثلاً چند مصدقہ مُستند معجزے۔ مُستند حالاتِ زندگی وغیرہ۔ اگر میرے کوائف ان شرائط کو پورا کرتے ہوں تو مجھے سینٹ بنا دیا جائے گا۔ برسوں یہ تحقیقات چلا کی۔ حسب معمول۔ میرا کیس ماسکو کے اسقفِ اعظم کے پاس بھیجا گیا۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ ۲۵ نومبر ۱۹۱۲ء کے روز مجھے سینٹ فلورا سابینا بنا دیا جائے گا۔ اس روز میرا جشن منانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ مگر اسی تاریخ سے چند روز قبل یہ چرچ اور خانقاہ ہی بند کر دی گئی۔ لہٰذا آفیشیل طور پر میں سینٹ فلورا نہیں ہوں۔ ویسے شاید ہوں۔ فادر اب تم بتاؤ تم نے ترکِ علایق کیوں کیا۔ دُنیا صرف مردوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ وہ خانہ فروشی کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہی پُرانا قصّہ —— محبوبہ کی بے وفائی —— ؟"

وہ چپ رہا۔

" خداوندا —— میں انتہائی عجز سے اقرار کرتی ہوں کہ عورت کی فطرت —— ساڑھے تیرہ سو برس موت کی نیند سونے کے بعد بھی نہیں بدلتی۔ میں نے بڑی دلچسپی سے کُریدا۔

" فادر گریگری —— کیا شہزادی کاتنکا تنا تن ہی تمھاری بے وفا محبوبہ تو نہیں تھی؟ کیونکہ خدا بخشے وہ بڑی دل پھینک اور عاشق مزاج خاتون مشہور تھی —— کیا اس کی وجہ سے تم خانہ برانداز ہوئے؟"

فادر نے تُرشی سے جواب دیا۔ " لیڈی فلورا۔ کیوں تم گڑے مُردے اکھیڑتی ہو۔"

" ہا ہا" ۔ میں نے اس کے سنس آف ہیومر کی داد دی۔ بلکہ بلیک ہیومر۔ اس نے مضطرب انداز سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

میں نے کہا —— " فادر —— زیادہ تمباکو نوشی تمھارے پھیپھڑوں کے لیے نقصان دہ ہے" —— معاً خیال آیا —— یہ بھی بلیک ہیومر ہے۔

"برسبیلِ تذکرہ۔ تمھاری اس بے حد دیندار تاتن کانے جارجیا پر عرب تسلّط کے فوراً بعد طفلس کے ایک عرب جنرل سے بیاہ رچالیا تھا۔" فادر نے خشکی سے کہا۔

"ارے۔" میں بھونچکی رہ گئی۔

"ظاہر ہے یہ تمھاری وفاتِ حسرت آیات کے بعد کا واقعہ ہے۔ میں لاکھ گرینڈ ڈیوک کا بیٹا سہی مگر عرب تسلّط کے بعد میری کیا حیثیت تھی۔ میں تو اپنی جاگیر کے معاملات سے بھی بے نیاز سارا وقت طفلس کے دارالمخطوطات میں گزارتا تھا۔ شہزادی تاتن کا ہوا کارُخ پہچانتی تھی۔ زمانہ اب عربوں کے ساتھ تھا۔ میں سیاست سے متنفر اور تاتن کا سیاسی داؤ پیچ کی استاد۔ مجھے پہلے پہلے بہت صدمہ ہوا۔ جذباتی اور ذہنی۔ پھر میں نے سوچا میاں گرمگری اور بیلیانی۔ عورت ذات اس لائق نہیں کہ اس کے لیے رو یا دھویا جائے۔ تضیع اوقات۔ رہی حسین لڑکیاں۔ تو ان کی کہیں کمی نہیں۔ وہ کون سی ناقابلِ حصول اشیاء ہیں؟ چنانچہ میں نے کتابوں میں جی لگایا۔ مگر طفلسی کے اسکوپٹوریم میں مستقل ریسرچ کے لیے ان راہبوں کے سلسلے میں شامل ہونا ضروری تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ راہب بھرتی ہوگیا۔ چند ماہ بعد قرطاجنہ چلا گیا۔ اور خاص اس مدرسے میں کام کیا جہاں سینٹ آگسٹین نے پڑھا تھا۔ پھر روما گیا۔ ایتھنز گیا۔ تمھارے وطن قسطنطنیہ گیا۔ نہیں۔ اپنی سیاحت کے دوران تمھارا تھیوڈور گیلاکسس مجھے کہیں نہیں ملا۔ کہیں مر مرا چکا ہوگا۔"

"خدا نہ کرے۔" میں بے ساختہ بول اٹھی۔ فادر ہنسنے لگا۔ "پھر بحرۂ اسود کے راستے گرجستان واپس آیا۔ نہیں۔ میں شہزادی کاتن کا کے کانونٹ بھی کبھی نہیں آیا۔ وہ سامنے جونیلگوں سلسلۂ کوہ دیکھتی ہو نا ——— اس کے دامن میں ایک رباط خانہ فروشاں موجود تھا۔ حملہ آوروں کی وجہ سے اس کی قلعہ بندی کی گئی تھی۔ چند راہبوں نے فرازِ کوہ میں پتھر کاٹ کر اپنے پوشیدہ حجرے تعمیر کیے تھے۔ بہت سے نوجوان خانہ فروش غاروں میں رہتے تھے۔ میں نے ایک الگ تھلگ چوٹی کے غار میں اپنا مسکن بنایا۔ سامنے پتھروں کی دیوار چن کر اس پر خوش رنگ پھولوں کی بیلیں چڑھائیں۔ قداسن کے لیے ہم لوگ وادی کے کینسہ بھری میں جایا کرتے تھے اور کھانا مل جل کر رباط کے ہال میں کھاتے تھے۔ ہم میں سے بہت سے خانہ بر انداز اسکالر رہ چکے تھے۔ رات کو اکثر علمی معاملات پر بحثیں ہوتیں۔ کوئی شامت کا مارا نسطوری ماورالنہر سے آنکلتا تو اس سے بھائیں بھائیں

کرتے وہ کہتا عذرا مریم مادرِ یسوع ہیں۔ مادرِ خدا نہیں۔ ہم کہتے ہیں۔ تمھارے پاس کیا ثبوت ہے۔
وہ کہتا تمھارے پاس کیا ثبوت ہے؟ ــــــــ کوئی سیرین پادری آ بھٹکتا اس سے جھڑپ رہتی
وہ کہتا مسیح کی وحدت فطرت کے قائل ہو جاؤ۔ ہم کہتے ہرگز نہیں ہوں گے۔ ان جھگڑوں سے تنگ
آکر کئی راہب طفلس پہنچے اور مسلمان ہو گئے۔

" غرضیکہ بڑا اچھا وقت گزر رہا تھا۔ عید میلاد المسیح سے دو روز پہلے کی بات ہے میں صبح
منہ اندھیرے باورچی خانے کے لیے لکڑیاں کاٹنے جنگل میں گیا۔ سارا جنگل برف پوش تھا۔ وادی
میں کلیسا کے سُریلے گھنٹے بج رہے تھے۔ اور خرگوش اور گلہریاں میرے چاروں طرف دوڑتی پھر
رہی تھیں۔ سینٹ گریگری کی ایک کونٹا کیا گنگناتے گنگناتے میں نے زور سے کلہاڑی جو درخت
کے تنے میں ماری وہ آکر میرے پانو میں لگ گئی۔ میں نے فوراً تھوڑی سی برف سے زخم صاف کر کے
ہرے پتّوں کی پٹی باندھی۔ لکڑیاں کاٹ کر خانقاہ واپس آیا۔ اور روزمرّہ کے مشاغل میں مصروف
ہو گیا۔ رات کو اپنے حجرے میں جا کر سونے سے پہلے حسبِ معمول موم بتّی جلائی اور سینٹ آگسٹین
کے اعترافات کا مُطالعہ شروع کیا۔ کلہاڑی کے زہر باد سے صُبح تک ختم ہو چکا تھا۔ وقت رحلت
سن شریف ۸۰ سال تھا مجھے معلوم نہیں اس مرقد میں کب اور کیوں منتقل کیا گیا؟

شاید شہزادی کاتن کانے تابوت یہاں منگوا لیا ہو۔ میں نے سوچا لیکن خاموش
رہی ــــــــ

الاؤ بجھ چکا تھا۔ سرد ہوا میں ہمارے ڈھانچے کھڑکھڑانے لگے۔ فادر گریگری نے کہا:
"آؤ چل کر کہیں سے گرم کپڑے تلاش کریں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

صنوبروں کے جنگل سے گزر کر ہم دونوں تیسرے ایک گرجا میں پہنچے جو نسبتاً بہت جدید
تھا یعنی گرجستان کی ملکہ گوران دُخت نے گیارہویں صدی میں بنوایا تھا۔ یہ شاید ایک "ورکنگ
چرچ" تھا کیونکہ اندر تیسرے مرصّع طلائی آئیکنوں کے سامنے اونچے شمع دان روشن تھے اور
معبدِ عذرا کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ہم اندر گئے۔ گیلری میں ایک الماری نظر آئی جس میں پادریوں
کے سیاہ چوغے لٹک رہے تھے۔ پادری شاید اپنے مکان میں محوِ خواب تھا۔ فادر گریگری نے
الماری میں سے دو لبادے مع ٹُوپیوں کے اُٹھائے جو ہم دونوں نے فوراً پہن لیے۔ جان میں جان آئی۔
عین اسی وقت الماری کے پیچھے ایک پرچھائیں دکھلائی دی۔ ایک شخص، چار خانہ کوٹ، براؤن
پتلون، سر پر گھنے کھچڑی بال، موٹے شیشوں کی عینک۔ وہ بھی ایک چوغہ چرانے میں مصروف

تھا۔ ہمیں دیکھ کر الماری کے پیچھے دبک گیا۔ ہم دونوں فوراً باہر آ گئے اور اس شخص کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لڑکھڑاتے کھڑکھڑاتے پہاڑی اترنے لگے۔ چند منٹ بعد پلٹ کر دیکھا وہ شخص بھی ایک خانہ فروش کے سادے لبادے میں ملفوف ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ہم نے جلدی سے خیمہ گاہ کا رُخ کیا تاکہ وہاں کے مجمع میں کھو جائیں۔ لیکن وہاں سے لڑکے اور لڑکیاں اب اپنے اپنے پیک اُٹھائے جہاز کی سمت بڑھ رہے تھے جو نزدیک جیٹی پر کھڑا تھا۔

ایک لڑکا اور لڑکی باتوں میں محو ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کی پشت پر جو بیگ بندھے ہوئے تھے ان میں دو دو جوڑی چمڑے کے دستانے آویزاں تھے۔ خادر گرہ گیری نے فوراً ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اس کے بعد وہ ایک خالی خیمہ میں گھس گیا اور وہاں سے دو جوڑ فل بوٹ اور دو مفلر اُڑا لایا۔ ایک اور خیمے سے سیاہ چشمے دو عدد پار کیے اب ہم دونوں نے ایک درخت کے پیچھے جا کر فل بوٹ سموری استر والے چرمی دستانے پہنے گوگلز سے آنکھیں اور مفلر سے گردنیں چھپائیں اور بیسویں صدی کے پچھترویں سال کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہوئے۔ اب ہمیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو مُردے جا رہے ہیں۔ ہمارے چہرے ہُڈ میں چھپے ہوئے تھے۔ آنکھیں گوگلز میں۔ جیتے جاگتے راہب اور راہبہ معلوم ہو رہے تھے۔

اب پو پھٹنے والی تھی۔ دریا پر گہری دُھند چھائی ہوئی تھی۔ جہاز نے روانگی کا بھونپو بجایا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا غول گاتا بجاتا گینگ وے پر چڑھنے لگا۔ وہ کئی سو طلباء تھے ہم بھی ان کی بھیڑ میں جا گھسے اور جہاز پر چڑھ گئے۔ دُھند کے اور بھیڑ بھڑکے میں ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔ جہاز پر پہنچ کر اب جو پلٹ کر دیکھتی ہوں تو وہ شخص پُر اسرار موجود۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چڑھ آیا تھا۔ ہماری طرح سیاہ چوغے اور سیاہ عینک میں رُوپوش۔ ہم خاموش رہے۔ وہ ساتھ ساتھ لگا رہا۔ ہم پھرتی سے ایک اندھیرے کونے میں دبک گئے وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ جہاز نے لنگر اُٹھایا اور جنوب کی سمت روانہ ہوا۔

ہم دونوں بھوک پیاس اور نیند سے بے نیاز تھے۔ اس تیسرے پر کیا گزر رہی ہو گی اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہوا۔ لیکن وہ بالکل چپکے بیٹھا رہا۔ دوسری رات جہاز بالٹومی پر لنگر انداز ہوا خوش وخرم اور صحت مند، تر و تازہ، گاتے بجاتے نوجوانوں کے جم غفیر کے ساتھ ساتھ ہم تینوں جہاز سے اتر کر ساحل پر آ گئے۔ اور جلدی جلدی ایک طرف کو چلنے لگے۔ پتہ ہی نہیں تھا کہ کدھر جا رہے ہیں۔ غرض محض بھاگنے سے تھی۔ سال بھر کے ایڈونچر کی خواہش جو مجھ سے کی تھی۔

چلتے چلتے ہم لوگ ایک جگہ پہنچے جہاں بہت ساری کشتیاں کھڑی تھیں۔ ابھی سورج نکلنے میں بہت دیر تھی اور ساحل سنسان پڑا تھا۔ فادر گرمگیری نے ایک موٹر بوٹ کا رسّا اس کے کھونٹے سے علیحدہ کیا اور تیرا نام لے کر اس میں کود گئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سوار کرایا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تیسرا کنارے پر موجود۔ یا اللہ۔ سُنا تھا کہ موت زندگی کا تعاقب کرتی ہے۔ یہاں اُلٹا حساب تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر زور سے کہا —— مجھے بھی ساتھ لے چلو —— مجھے بھی۔ اس نے پہلی دفعہ بات کی تھی۔ فادر نے اشارے سے اس کو بوٹ میں بلا لیا۔ اور انجن اسٹارٹ کیا۔ اس مہارت سے گویا ساتویں صدی عیسوی کے دریائے کرا میں آپ موٹر بوٹ ہی پر طفلس آیا جایا کرتے تھے۔

وہ شخصِ نامعلوم آکر ہمارے برابر بیٹھ گیا۔ فادر گرمگیری نے ایکدم پروفیشنل آواز میں دریافت کیا —— "پیارے بیٹے تمھیں کیا تکلیف ہے۔ تم ملکہ گوران دخت کے گرجا سے لے کر یہاں تک ہمارا تعاقب کیوں کر رہے ہو —— ؟"

معاً مجھے مخاطب کیا —— "یہ جیٹ کشتی ہے —— " پھر اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے "ہاں۔ تو پیارے بیٹے تمھیں کیا تکلیف ہے۔ ؟"

اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا "فادر۔ میں ایک ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل ہوں۔ ویسٹ کو ڈی فیکٹ کر رہا ہوں۔ میری مدد کرو۔"

"ویسٹ —— ؟ فادر نے فوراً کشتی کا رُخ مغرب کی طرف کر دیا۔ "بلغاریہ کی کون سی بندرگاہ جانا چاہتے ہو اِس لمحے فادر گرمگی اور بیلیانی کی کھوپڑی سے علومِ حاضرہ اور معلوماتِ عامہ شاید عارضی طور پر غائب ہو چکی تھی۔ یا ان کی کھوپڑی اس وقت کہیں اور تھی۔ بہر حال۔ اس شخص نے گھبرا کر کہا —— "فادر شاید آپ ۴۵ء کے بعد سے اپنی خانقاہ سے باہر نہیں نکلے۔"

"۴۶ء میں میں طبلسی میں تھا" —— فادر بولا۔ مگر شکر ہے موٹر کے شور میں اس شخص نے یہ بات نہیں سُنی۔ وہ کہتا رہا۔ "فادر۔ ویسٹ اب دیوارِ برلن کے دوسری طرف سے شروع ہوتا ہے —— "

خداوندا۔ میں بھولی بھالی حوّا کی ناقص العقل بیٹی۔ میں بول اُٹھی:

"دیوارِ چین تو میں نے بھی سُنی ہے —— سدِ سکندری اور دربند ہمارے کوہستان قفقاز ہی میں موجود ہیں —— یہ دیوارِ برلن کہاں ہے ؟"

فادر نے مجھے ٹھوکا دیا کہ چپ رہوں۔ اس لمحے فادر گریگری کی ساری عصری حیثیت واپس آچکی تھی۔ انھوں نے موٹر بوٹ کا رُخ ترکی کی طرف کر دیا۔ کشتی کھلے سمندر میں فراٹے بھرتی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ فادر نے اس ڈسی ڈونٹ انٹلکچوئیل سے کہا "پیارے بیٹے۔ خدا کو یاد کرو جس نے یونس پیغمبر کو بچایا۔ ہمارا بھی حافظ و ناصر ہے اور سمندروں کا ستارہ ——— عذرا مریم ہماری رہ نمائی کرنے والی ہیں ———"

"آمین ———" میں نے کہا۔ "پیارے بیٹے۔ خداوند کریم بادبانی جہازوں اور کاروانوں کے رہبر کو یاد کرو۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ تم صحیفۂ اولیاء اور مسیحی شہیدوں کے احوال، پابندی سے پڑھتے ہو گے۔"

اس نے جواب دے دیا: "میں صرف ملارمے، کافکا، اور بودلیئر کا مطالعہ کرتا ہوں۔"

خدایا۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ان اولیاء کے نام پہلے نہ سُنے تھے۔

ربّ العالمین ——— اس کے بعد کا سارا احوال تجھ پر روشن ہے۔ ہم کس طرح کن ایڈونچرز کا سامنا کر کے بالآخر وی آنا پہنچے۔ وہاں کس طرح ہمارا خیر مقدم ہوا۔ ڈسی ڈونٹ انٹلکچوئیل نے کس طرح پریس کانفرنس بلائی۔ ٹی۔ وی اور پریس سے انٹرویو کتابوں کے کنٹریکٹ۔ دعوتیں اور عصرانے۔ میں اور فادر گریگری ہر جگہ ساتھ۔ لیکن وی آنا پہنچتے ہی فادر نے ڈسی ڈونٹ انٹلکچوئیل سے کہہ دیا تھا کہ تم سب کو اچھی طرح سمجھا دو۔ میں اور مدر فلورا دونوں کلیسائے گرجستان کے ایک ایسے قدیم ترین آرڈر سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اراکین مرتے دم تک مکمل طور پر خاموش رہنے کا عہد کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں کو انٹرویو دینے سے معاف رکھا جائے۔ روزمرہ کی ضروریات کے متعلق ہم دونوں ایک پرچی پر چند الفاظ لکھ دیا کریں گے۔ علاوہ ازیں ہم تصویریں بھی نہیں کھنچوائیں گے کہ یہ اظہارِ خودستائی و خودنمائی ہے۔ انٹلکچوئیل نے یہ پیغام صحافیوں کو دے دیا۔ ایک تہلکہ مچ گیا۔ ورلڈ پریس میں سُرخیاں چھپیں۔ "فادر گریگری اور مدر فلورا کا ہمیشہ کے لیے خاموش رہنے کا عہد۔" اس کے بعد پیرس میں ایک صحافی نے اصرار کیا: "میرے سوالات کا جواب پرچے پر لکھ کر دے دیجیے۔" فادر نے جواباً لکھا "میں بوجوہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" چنانچہ مزید سرخیاں: "فادر گریگری کا بیان۔ وہ بوجوہ کچھ کہنا نہیں چاہتے۔"

پیرس سے ہم لوگ لندن لے جائے گئے۔ وہاں بھی یہی ہنگامہ رہا۔ اب ہمارا معمول

سے بات کی ہے اور اس سے کہا ہے۔ ہم پہلے اپنے چند جاز مین رشتے داروں سے ملنے فلاڈیلفیا جائیں گے اس کے بعد کچھ عرصہ نیویارک میں چند عزیزوں کے ساتھ قیام کریں گے کیونکہ یہاں کتب خانوں میں تھوڑا سا کام کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک خطیر رقم اس عرصے کے اخراجات کے لیے دے دی ہے۔ کل صبح یہاں سے چیک آؤٹ کر جائیں۔ لہٰذا دوسرے روز ہم ڈسی ڈنٹ اٹلکچوئیل اور اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہہ کر ملٹن سے ٹکٹ لیے۔ فادر نے ایک معمولی بورڈنگ ہاؤس میں دو کمرے کرائے پر لیے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی۔ فادر سائنس اور ٹیکنولوجی اور عالمی سیاست پر تازہ ترین کتابیں خریدتا۔ میں فیشن میگزین۔ وہ کتب خانوں میں وقت گزارتا۔ میں ونڈو شاپنگ کرتی۔ ایک روز، ایک بک شاپ میں میں نے کیا دیکھا کہ فادر پلے بوائے کا بغور مطالعہ کر رہا ہے مجھے دیکھ کر جھینپ گیا۔ بولا: اس رسالے میں انٹرویو بہت عمدہ چھپتے ہیں۔ میں سال بیلو پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔

فادر کتب خانوں سے ایک آدھ کتاب چرا بھی لاتا تھا اور سگریٹ نوشی کی لت ایسی پڑی تھی کہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مسلسل سگریٹ پیتا تھا۔ پبلک میں سگریٹ پی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے لیے ہڈ میں چھپا ہوا چہرہ کھولنا پڑتا۔

سال بھر کی مہلت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ پھر گان آ چکا تھا۔ ہر طرف درختوں میں سرخ پتے جھلملا رہے تھے۔ میری بڑی تمنا تھی کہ کم از کم ایک خوبصورت لباس خرید کر اپنے کمرے میں اسے پہن لوں۔ فادر پکا MALE CHAUVINIST تھا، میری اس تمنا کو لاپروائی سے نظر انداز کرتا رہا۔ بلکہ میرے حصے کے ڈالر بھی اپنی کتابوں پر خرچ کر ڈالے۔ اکثر جا کر سینما اور تھیٹر دیکھتا۔ مجھ سے کہہ جاتا۔ تمہارے کمرے میں ٹی۔ وی ہے اسے دیکھو۔ اور پھر عبادت کرو۔

ہائے اللہ۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی۔ میں نے تیرے بھلکڑ فرشتے سے پوچھا تھا: فرض کرو ہم وقتِ مقررہ پر خاص اس مرقد میں نہ پہنچ سکے تو کیا ہوگا۔ اس نے جاتے جاتے جواب دیا تھا کہ تم جہاں بھی ہو کسی نزدیک ترین قبرستان چلے جانا اور دو خالی قبروں میں جا پڑنا۔ سال ختم ہونے والا تھا۔ خدایا تیری اتنی بڑی، اتنی دلچسپ پرکشش اور اتنی ترقی یافتہ دنیا میں ہم تو ابھی کچھ بھی نہ دیکھ پائے۔ فادر نے قبرستان تلاش کرنے کا کام بھی مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ خود سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتا اور میں گورستانوں کے چکر لگاتی کہ کہیں دو خالی قبریں

یہ تھا کہ انٹلکچوئیل میڈیا کے نمائندوں میں گھرا رہتا۔ فادر گرجا گھروں کی کتب خانوں میں وقت گزارتا۔ میں ونڈو شاپنگ کرتی پھرتی۔ ہم لوگ بہترین ہوٹلوں میں ٹھیرائے گئے۔ پریس نے ہماری "خواہشات کا احترام" کر کے مجھے اور فادر کو بالکل تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے میزبان بھی اگلے دن کے پروگرام کے متعلق جو کچھ کہنا ہوتا ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل کو بتا دیتے تھے۔

ایک مہینے بعد، یا غفور و رحیم۔ تجھے بخوبی علم ہے کہ ہم تینوں امریکہ مدعو کیے گئے۔ جہاں پروگرام کے متعلق ہم تینوں مستقل سکونت اختیار کرنے والے تھے۔ انٹلکچوئیل اب بے طرح معروف تھا۔ اپنی کتاب اور سلسلہ وار مضامین کے لیے نہایت کثیر رائلٹی پیشگی وصول کر چکا تھا اور عیش کر رہا تھا۔ ہم لوگ ہلٹن میں ٹھیرائے گئے۔ اب یہاں مجھے اور فادر کو اسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا جس نے ہم کو مغربی یورپ اور انگلینڈ کے ہوٹلوں میں پریشان کیا تھا۔ الٰہی تو واقف ہے کہ ہم دونوں بھوک، پیاس، نیند اور باتھ روم جانے کی حاجتوں سے بے نیاز تھے۔ لہٰذا ہم اپنے کمروں میں نہ بریکفاسٹ منگواتے۔ نہ کھانا کھانے کے لیے نیچے جاتے۔ نہ روم سروس کو کسی ضرورت کے لیے فون کرتے۔ لیکن سب سے بڑا معاملہ باتھ روم تھا۔ کموڈ پر بندھے کاغذی ربن جوں کے توں سلامت رہتے۔ تولیہ، صابن، واش بیسن ہر چیز UNTOUCHED صبح کو میڈ صفائی کے لیے آتی تو متحیر ہوتی۔ فادر سے اس سلسلے میں بات کرتے مجھے شرم آتی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اس سے کہا، وہ بولا ——— "عورت واقعی ناقص العقل ہے۔ یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ میں کاغذی ربن علیحدہ کر دیتا ہوں۔ واش بیسن کے آس پاس پانی چھڑک دیتا ہوں۔ ذرا سا چھینٹا صابن پر ڈال دیتا ہوں۔ یہ کوئی پرابلم نہیں۔" کھانے پینے کے متعلق ہم نے دی آنا ہی میں اپنے میزبانوں سے کہہ دیا تھا کہ ہم دونوں مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کو محض جو کی روٹی پیاز، پنیر اور سادے پانی سے افطار کرتے ہیں۔ چنانچہ نہایت پُر تکلف نقرئی کشتیوں اور بڑھیا برتنوں نیپکن سے ڈھکی "افطاری" ہمیں شام کے وقت ہمارے کمروں میں پہنچادی جاتی تھی جسے ہم کاغذی بیگ میں رکھ کر صبح کو باہر لے جاتے اور سڑک کے کنارے کسی ڈسٹ بن میں ڈال آتے۔ لیکن ہلٹن میں قیام کے چوتھے روز فادر نے مجھ سے کہا۔ "ہمارے میزبانوں نے ہمیں ویسٹ کوسٹ کے گریک اور تھوڈوکس خانقاہوں میں بھیجنے کا انتظام کیا ہے۔ نیچے آؤ تو میں تم سے مشورہ کروں۔"

میں گھبرائی ہوئی نیچے گئی۔ فادر نے کہا ——— "میں نے ابھی ابھی کمیٹی کے سکریٹری

دکھلائی دے جائیں تو انھیں نظر میں رکھوں۔

واپسی کے لیے اب صرف چند روز باقی رہ گئے تھے۔ پیسہ قریب الختم تھا۔ فادر اس کے لیے تیار نہ تھا کہ میزبانوں کو فون کر کے مزید ڈالر مانگے۔ وہ پوچھتے تم لوگ اب تک یہاں کیا کر رہے ہو، ولیسٹ کوسٹ کی خانقاہ کیوں نہیں گئے۔ باقیماندہ ڈالر سے (جو میرے حصّے ہی کے تھے) میں اپنی پہلی اور آخری خواہش ——— ایک گاؤن خریدنا چاہتی تھی۔ لیکن فادر اس رقم سے عرب آئل کی اقتصادیات اور یوروپین کامن مارکیٹ پر دو کتابیں خرید لایا۔ میں روٹھی۔ اس نے کہا۔ "وقت بہت کم رہ گیا ہے دن رات لگ کر یہ پڑھوں گا۔" پھر مجھے بہلانے کے لیے بولا: "ذرا یہ تو سوچو ہمارے انڈر گراؤنڈ ہو جانے پر ساری دنیا میں کس قدر تہلکہ مچے گا۔" (میں نے "انڈر گراؤنڈ" کی فوراً داد دی) "امریکن اور روسی دونوں یہ سمجھیں گے کہ ہم ڈبل ایجنٹ تھے اور بے چارے ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل پر آفت آئے گی۔ مگر صورتِ حال ایسی ہے کہ ہم اس غریب کی کسی طرح مدد نہیں کر سکتے۔ آؤ ذرا ٹہل آئیں۔"

ہم گھومنے نکلے۔ ایک عالی شان دوکان میں کرسچین دیور کی تازہ ترین تخلیقات کی نمائش ہو رہی تھی۔ میں فادر کو دوکان میں گھسیٹ لے گئی۔ فیشن شو شروع ہو چکا تھا۔ اس دوکان کا مالک کوئی کیتھولک تھا۔ ہمارے سیاہ لبادے دیکھ کر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ہم جا کر ایک پچھلی قطار میں بیٹھ گئے۔ میں ملبوسات کو اور فادر گریگری ماڈل لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ اچانک میں حیرت زدہ رہ گئی۔ ایک ماڈل لڑکی ارغوانی اطلس کا گاؤن پہنے سامنے سے گزری جس کے کنارے اور پیٹی پر موتی ٹکے تھے۔ تقریباً اسی وضع کا بازنطینی قباچہ میں نے اس رات صحرائے سوریا کی خانقاہ کے حجرے میں آخری بار اتار کر راہبہ کی کھردری ردا پہنی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ نہایت بیش قیمت لباس تھا۔ کئی ہزار ڈالر کا رہا ہو گا۔

فادر نے چپکے سے پوچھا۔ "لیڈی فلورا اسابینا۔ کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟" میں نے کہا۔ "ہاں - فادر گریگری۔" وہ چپ رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا "تم اب گھر چلی جاؤ۔ میں رات گئے آؤں گا۔" میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔

رات کے دو بجے فادر بورڈنگ ہاؤس پہونچا۔ اس کا کمرہ میرے کمرے کے پہلو میں تھا۔ میں نے کھڑ پڑ کی آواز سنی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کواڑ کھولا۔ اس نے اپنے کلوک کے اندر سے ایک پیکٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔ اطمینان سے کہا ——— بھیڑ بھڑکے

میں ایک بیک روم میں جا گھسا۔ یہ گاؤن سامنے ہی ہینگر پر موجود تھا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"
وہ اپنے کمرے میں جا کر آئل کرائسس پہ کتاب پڑھنے میں مشغول ہوا میں نے گاؤن پہنا۔ اس میں PADDING کی کافی سے زیادہ ضرورت تھی۔ دوسرے روز میں دوکان سے مطلوبہ سامان خرید لائی۔ پھر دو دن کمرے میں بیٹھ کر سارے گاؤن کے نیچے روئی کا موٹا استر لگایا۔ اب جو پہنا تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ایک ڈھانچے نے زیب تن کیا ہے۔ تیسرے پہر کو فادر میرے کمرے میں آیا، مجھے اس لباس میں دیکھ کر سیٹی بجائی۔ ہم لوگ پارک میں جا کر اپنی پسندیدہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ فادر اُداسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے سیاہ لبادے کی جیب سے ایک کتاب برآمد کی اور آہستہ سے بولا۔ "آج میں لائبریری سے آئرلینڈ کے شاعر ڈبلیو، بی، ایٹس کی کتاب چرا لایا ہوں۔" ہمارے چاروں طرف شاہ بلوط کے خزاں زدہ سُرخ پتّوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سورج ڈوبنے والا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ فادر گریگری اور بیلیانی نے کہا۔ "اس نظم کا عنوان ہے SAILING TO BYZANTIUM تو سنو۔" اس نے گمبھیر آواز میں آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔

وہ سرزمین ضعفا کی نہیں۔ شادماں نوجوان۔ طائرانِ چمن۔ مرتے جاتے ہیں، جو اور ہیں محوِ لحن۔ یم بہ یم مچھلیوں کے وہ سیمیں شنا، مرغ و ماہی و انسان، ہر جاندار، جشنِ جاں میں ہے مشغول وقتِ ثمر۔ جو کشش دم کی رامشگری میں مگن، بھول جاتے ہیں ہم نقش ہائے کہن ذہن جاوید کے معجزاتِ جلیل[1]۔

ہے حقیر و تہی ایک مردِ کہن۔ چوبِ دستی پہ لٹکا ہوا پوستیں۔ اگر جوش سے رُوح نہ ہو نغمہ زن، فانی پوشش کے ہر خستہ جاں کے لیے۔ شعر و نغمہ کی کوئی روایت نہیں، کاملوں سے کرے جو نہ کسبِ ہنر، اپنی عظمت کی تعظیم جو خود نہ کرے۔ تو قلزم بہ قلزم میں باز نطیم کے بلادِ مقدس میں وارد ہوا ہوں۔

نقش دیوار کی پچی کاری کے سونے کے مانند۔ شعلۂ قدس میں مستم عاقلو۔ آتشِ پاک سے باہر آؤ ذرا۔

---

[1] ایٹس کا نظریہ تھا کہ انسان اگر تکمیلِ فن میں مصروف رہے تو اسے زندگی سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔ آرٹ اور زندگی کی DICHOTOMY ایٹس کا خاص مسئلہ ہے۔

[وقت و تاریخ کی] گردش مستقل ——— رقص اس میں کرو۔ پیر نغمہ جو تم مری روح کے۔
پھونک ڈالو یہ دل۔ راکھ اس کو کرو کثرتِ آرزو سے جو ہے مضمحل جاں بلب جانور سے بندھا ہے
اور خود اپنی حالت سے واقف نہیں ——— مجھے ابدیت کی صنعت کی آغوش میں کیوں نہ
لے لو۔

اک بار فطرت سے ہو ماورا میں، پیکر میں اپنا پھر اس سے نہ لوں گا۔ مگر ایسا پیکر جو یونان کے
کسی استاگر نے ورق طلا سے بنایا ہو ایسا، غنودہ شہنشاہ جگائے جو رکھے۔ یا اک شجر زریں پہ
میں بیٹھ جاؤں۔ اور بازنطیم کے امیروں کی خاطر، فلک مرتبت مہ جبینوں کی خاطر[1] میں گیت
گاؤں۔ گاؤں میں اس کا۔ گزر جو چکا ہے، گزر اب رہا ہے، یا ہونا ہے باقی۔
میں جل بھل رہی تھی۔ خاور نے کتاب بند کر کے ایک لمبی سانس لی اور کہا چلو
آخری بار ڈاؤن ٹاؤن ہو آئیں۔ ہم دونوں پارک سے نکلے۔ ٹیکسی پر شہر پہنچے۔ راستے میں ایک
شاندار ہوٹل پر لکھا نظر آیا "اسرائیل فنڈ کے لیے ماسک بال"۔ خاور نے مجھے دیکھا میں نے
اسے۔ ہم ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور پر اتر گئے۔ پارک سے چلتے وقت میں نے اپنا سیاہ لبادہ اپنے
گاؤن کے اوپر پہن لیا تھا۔ حسب معمول سیاہ چشمے، اور ہڈ میں روپوش ہم نے دوکان میں جاکر
دو ماسک خریدے اور سنہرے وِگ۔ زنانے اور مردانے کلوک روم میں جاکر ہم دونوں تیار
ہوئے۔

خاور چلتے چلتے اپنے لیے ایک بڑھیا اسکارف خریدنے لگا۔ تب میں نے اسے پھر یاد دلایا
کہ آج ہماری مہلت کا آخری دن بلکہ آخری شام ہے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہمیں انڈر
گراؤنڈ ہونا ہے۔ جو قبرستان میں نے تلاش کیا ہے ہمارے جائے قیام سے کافی دور ہے۔
سارے پیسے مت خرچ کر دو۔ قبرستان جانے کے لیے ٹیکسی کرنی ہوگی۔ پھر بھی اس نے
قیمتی سگرٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔ ہم بھاگم بھاگ ہال میں پہنچے۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا ہم
نے سب سے کم قیمت کے دو ٹکٹ خریدے۔ صدر دروازے پر فنٹ مین نام اناؤنس کر رہا تھا۔
خاور نے (جو اپنے سیاہ لبادے میں تھا صرف چہرے پہ ماسک پہن لیا تھا) متانت سے کہا۔

---

[1] بازنطینی موزیک کی لازوال دیواری تصاویر جو گویا شاعر کی خیالی سامعین ہیں کیونکہ مرگ و
فنا سے ناآشنا ہیں۔ (ق۔ ح)

"پرنسس کاتنکاتناتن آف جارجیا، گرینڈ ڈیوک اور بیلیایانی آف طبلسی"۔
ہوٹل کا چوبدار ہمیں انقلاب کے بعد آئے ہوئے سفید روسی سمجھا۔ اندر جاکر ہم دیوار کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڑا شاندار رنگا رنگ مجمع تھا۔ آرکیسٹرا "بلیو ڈینوب" بجا رہا تھا۔

چند منٹ بعد فادر سگریٹ پینے کے لیے باتھ روم چلا گیا۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اب صرف دو گھنٹے بعد قیامت تک قبر کی تنہائی اور تاریکی۔ تب دفعتاً مجھے وہ دکھلائی دے گیا۔ بھیوڈور گیلاسس ——— وہی سنہرے گھنگریالے بال، لمبا، اونچا، پورا۔ یونانی ناک۔ وہ ایک رومن سینیٹر کا بھیس بدلے ایک "ہسپانوی رقاصہ" کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کیا یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ خدایا میں بالکل بوکھلا گئی۔ وہ کئی بار ناچتا ہوا میرے سامنے سے گزرا اور شاید مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر رقص کے بعد خود میرے پاس آیا اور اپنے ساتھ ناچنے کی درخواست کی۔ میں نے ہڑبڑا کر کہا: "میرے پانو میں موچ آگئی ہے بھیوڈورک ———"

اس نے صرف آنکھوں پر سیاہ ماسک پہن رکھا تھا۔ وہ اتارا۔ وہ کوئی اور تھا ——— میرے بھیوڈورک سے ہلکی سی مشابہت ضرور تھی۔ لیکن کوئی اور تھا۔ بھلا وہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مگر مجھ سے رہا نہ گیا انتہائی حماقت سے پوچھا۔ "معاف کیجیے کیا آپ کا نام بھیوڈورک گیلاسس تو نہیں ہے؟" اس نے کہا۔ "جی نہیں۔ میں رچرڈ کو ہین ہوں۔ کولمبیا میں پڑھتا ہوں۔" پھر دو چار باتیں کر کے چلا گیا۔ چند منٹ بعد فادر سگریٹ پی کر واپس آیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی دیوار کے کلاک پر نظر ڈالی ——— اور کہا "لیڈی فلورا ——— اب چلنا چاہیے ——— دس بج چکے ہیں ——— چلو ——— اٹھو ———"

تب اس وقت معاً ایک دہشت ناک خیال میری کھوپڑی میں آیا۔ میں نے بوکھلا کر کافی اونچی آواز میں بزبانِ انگریزی کہا ——— (ہم دونوں جب سے لندن پہنچے تھے اور وہاں سے امریکہ، اب مستقل انگریزی میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ فادر کی تاکید تھی ——— کہ اس طرح ایک نئی زبان بولنے کی پریکٹس رہے گی۔ میں چڑ کر اس سے کہتی فادر ہمیں صرف چند مہینے اس دنیا میں اور رہنا ہے۔ میں کیوں اپنی کھوپڑی کھپاؤں تو وہ جواب دیتا لیڈی فلورا ——— انسان عام طور سے حد سے حد ساٹھ ستر سال دنیا میں زندہ

رہتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے بھی بہت کم۔ لیکن اس احساس کے باوجود کہ اس کی عمر کی مدت بہت مختصر ہے، وہ زندگی کا آدھا حصہ حصولِ علم میں صرف کرتا دماغ کھپاتا ہے محنت کرتا ہے۔ اور اپنی ساری تعلیم، علمیت، تجربے خود آگاہی کے باوجود ——— ایک روز پٹ سے مر جاتا ہے۔ اب چاہے ایک شخص کو دس سال اور جینا ہو یا ایک سال بات تو ایک ہی ہے" اللہ فادر بڑا ھبکی تھا ———) بہر حال۔ تو ہم لوگ ہمیشہ سرگوشی میں گفت گو کرتے تھے لیکن اس وقت کلاک پر نظر پڑتے ہی میں گھبرا کر اونچی آواز میں بزبانِ انگریزی بول اٹھی " ہمیں جو وقت بتایا گیا تھا کیا وہ گرینچ مین ٹائم تھا ——— ؟ روس کے اور یہاں کے وقت میں تو کم از کم اٹھارہ گھنٹے کا فرق ہوگا ——— اور ——— اس نے تو پرانے رُوسی کیلنڈر کے حساب سے ۲۳ ستمبر کہا تھا ———"

اس پر فادر گریگری بھی ہڑبڑا کر بولا ——— ارے ——— "اب کیا ہوگا ——— ؟"

"اب ——— یہ ہوگا ———" ایک پولیس افسر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہم دونوں دہشت زدہ ہو کر صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے گرد ناچنے والوں کا مجمع لگ گیا۔ پولیس افسر کے ساتھ دو سپاہی موجود تھے۔ اس نے فادر کو درشت آواز میں مخاطب کیا ——— " فلاں ڈیپارٹمنٹ اسٹور سے یہ گاؤن جو تمھاری گرل فرینڈ نے پہن رکھا ہے تم چُرا کر بھاگے تھے۔ پولیس اس رات سے تمھاری تلاش میں مصروف ہے۔ یہ گاؤن جیکلین اوناسس کی فرمائش پر خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ مختلف لائبریریوں سے بھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص راہب کے بھیس میں نادر کتابیں چُراتا پھر رہا ہے۔ لیکن یہ بیش قیمت گاؤن ——— تم دونوں کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا"

تب فادر گریگری اور بیلیانی نے مجھے دیکھا اور میں نے فادر گریگری اور بیلیانی کو۔ ہم دونوں نے پہلے اپنے دستانے اتارے۔ اپنے پنجے اپنے چہروں کی طرف لے گئے۔ سیاہ چشمے الگ کیے اور اپنے اپنے ماسک اتارے۔

OO

غیاث احمد گدّی

صبح ہوتی دن چڑھتا، اور جب ٹھیک نصف النہار پر پہنچتا، شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی، ٹھیک ویسے ہی جیسے میونسپلٹی کی گاڑی کتے پکڑنے کے لیے نکلتی ہے۔ یہ گاڑی جو چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند بےحد خوبصورت ہوتی کہ نگاہ اٹھ کے داد دیتی، اس کے چاروں طرف ننھی ننھی گھنٹیاں بندھی ہوتیں جو چلتے وقت دھیرے دھیرے بج رہی ہوتیں۔ گھنٹیوں کی آواز عجیب ہوتی، کچھ ایسی جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو۔ ایک لمبا، خمیدہ کمر، زرد رو آدمی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا۔ بالکل اسی طرح دوسرا آدمی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوتا، جس کے ہاتھ میں پتلا سا بہت لمبا بانس ہوتا، بانس کے سرے پر برش جیسا گچھا سا ہوتا جس پر گوندیا اسی طرح کی چپک جانے والی لس دار رطوبت لگی ہوتی، جس سے وہ

پرندہ پکڑنے والی گاڑی

پرندوں کو پکڑتا تھا۔

دیوار پر، چھتوں کی منڈیروں پر، ٹیلی فون کے کھمبوں، پیڑوں یا فرش پر دانہ دنکا چنتے ہوئے پرندے جہاں نظر آتے وہ آدمی بانس کو آگے بڑھا دیتا اور جن پرندوں کے پروں پر لس دار رطوبت لگا ہوا گچھا چھوا دیتا۔ پہلے تو وہ پرندہ تڑپتا، چھٹپٹاتا، اڑنے کی کوشش کرتا پھر تھک ہار کر لس دار رطوبت سے چپڑ چپڑ کرتے ہوئے پروں کی قوتِ پرواز کے الجھ جانے کے باعث ایک طرف اوندھا ہو کر لڑھک جاتا۔ تب وہ آدمی جلدی سے بڑھتا اور دونوں ہاتھوں سے جھپٹ کر پرندے کو پکڑتا، دھیرے سے گاڑی کے چھوٹے سے دروازے کو کھولتا، اس میں پرندے کو دھکیل دیتا، دروازہ بند کرتا، پھر غور سے شیشے کے اندر دیکھتا، جہاں پرندہ پھڑپھڑا کر تھک جاتا، اس وقت اس آدمی کے چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر جاتی اور آنکھیں اندھیرے میں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھتیں۔

ہر روز جیسے سورج سروں پر آتا، تیز کرنیں سروں پر گرتیں، پچھمی دروازے کی جانب سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی صدا سنائی دیتی، ذرا دیر بعد بڑی سُبک خرامی سے ایک آدمی، جس کا چہرہ بے حد زرد ہوتا اور اس کی آنکھیں نیم وا ہوتیں، اس کی کمر سے پتلی سی رسّی لپٹی ہوتی، جو گاڑی کے سرے سے بندھی ہوتی اور وہ نیم غنودگی کے عالم میں چلتا بڑھا آتا، پھر جہاں کوئی چڑیا کوئی پرندہ نظر آتا، وہ آدمی آپ ہی آپ رُک جاتا اور اپنے پیچھے آنے والے آدمی کو پرندہ کی طرف اشارہ کرتا۔

یہ روزمرہ کا دستور ہوتا، دوکان دار دکانوں میں ہوتے، راہ گیر چلتے چلاتے رہتے، موٹر کاریں تیزی سے یوں پاں کرتی گزرتی ہوتیں، جو تانگے والا کا ٹھٹا رہتا، خرید و فروخت رہتی، شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی، لین دین کا بازار اتنا جواں ہوتا کہ اوّل تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اٹھتی، لیکن ان میں سے کسی کی نظر اُٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلہ سے اٹھتا، گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے تو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکّے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے، پھر وہ آدمی سکے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھ اور چہروں سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، یہ بھی کچھ زیادہ دیر نہیں رہتا، فقط چند منٹ، دس یا بیس منٹ تک۔ پھر حیرت کا یہ وقفہ کم ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے محض چند سیکنڈ رہ گیا تو، اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندے پکڑنے والی گاڑی آگئی ہے، اور پرندہ پکڑتی چلی جا رہی ہے اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔

ایسی ہی کیفیت والا ایک دن تھا، جب میں نے ایک دکان دار کو جلیبیوں کی تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، کہ "میاں دیکھو جلیبیوں پہ کتنی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں؟... ابھی جب شہر میں بیماری پھیلی ہوئی ہے، یہ مکھیاں کتنی خطرناک... !"

"مکھیاں... ؟" حلوائی نے کاہلی سے ہاتھ ہلا کر مکھیوں کو اڑانے کی کوشش کی، مکھیاں ذرا دیر کو اُڑیں پھر جلیبیوں کی تھال پہ ٹوٹ پڑیں... "ہاں مکھیاں تو

سائی اُڑتی ہی نہیں۔"

حلوائی نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر تم کو کیا صاحب، تم کو تو نہیں خریدنا۔"

میں نے جواب میں انکار کیا تو حلوائی نے آنکھ ماری اور سرگوشیوں سے ذرا قریب کے لہجے میں کہا "اور مجھ کو بھی کیا صاحب، مجھ کو بھی تو کھانا نہیں۔۔۔!

بس یہیں سے میں چونک گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اور شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا تو کیا ملے گا، کوئی خدا کا بندہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں بات آگئی، میری پیشانی پر جو بہت دیر سے بلکہ کئی دنوں سے ایک تیوری کسی سنتری کی طرح کھڑی دکھ رہی تھی سمٹ گئی، پھر میں ہنسا اور میں نے بھی گفتگو سے ذرا دور کے لہجے میں کہا، "تو بھائی حلوائی ایک کام کرو نا، ان گاڑی والوں کی توجہ مکھیوں کی جانب مبذول کرا دو۔۔۔!"

حلوائی چونک گیا۔۔۔ اور اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، لیکن پل بھر میں سنجیدہ ہو گیا۔

"ارے ہاں۔۔۔ مگر کیوں صاحب، مجھے اس جھنجھٹ سے کیا فائدہ؟"

"یہ، جو مکھیاں جلیبی کا سارا رس۔۔۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک کہا سارا رس چوس لے جاتی ہیں کم بخت۔۔۔ مگر صاحب مجھے اس سے کیا نقصان، مجھے تو فائدہ ہے۔"

"وہ کیا" میں نے حلوائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا، "فائدہ کیسے ہے؟"

حلوائی پہلے ہنسا پھر اس نے اپنے بنا سپتی میں چپڑے ہوئے توند پہ ہاتھ پھیرا اور بے حد سنجیدہ ہو کر میری طرف جھک گیا۔ بابو تم کیا جانو دُنیا داری، یہ راز کی بات ہے۔ دنیا ایسے نہیں چلتی۔۔۔ پھر حلوائی خاموش ہو گیا اور ذرا گہرا ہو کر پھر گویا ہوا۔۔۔ پر تو اپنا ہمدرد لگتا ہے اس لیے بتاتا ہوں، کسی سے کہنا نہیں۔ تو بابو جلیبیوں کا یہ رس، جو مکھیاں چوستی ہیں تو پھر رس اور مکھیاں کہاں جاتی ہیں ذرا اتنا تو بتاؤ؟"

"کہاں جاتی ہیں۔۔۔ مجھے پتہ نہیں، حلوائی میاں تم ہی بتاؤ؟"

"کہیں نہیں جاتیں۔۔۔" حلوائی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "رس مکھیوں کے پیٹ

میں اور مکھیاں جلیبیوں کے ساتھ پڑے پڑے... سمجھے بابو؟ ایسے فائدہ ہوا!"

لیکن میں بہت دیر تک سمجھ نہ سکا اور بے وقوفوں کی طرح حلوائی کے چہرے کو تکتا رہا، حلوائی پھر ہنسا، پھر مونچھوں پر تاؤ دیا، نہیں سمجھے اب بھی...؟"

ابھی ہماری گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ پچھمی دروازے کی جانب گھنٹیوں کی آواز سنائی پڑی اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی، ذرا دیر بعد وہ زرد رو خمیدہ کمر آدمی دکھائی پڑتا ہے، حسب دستور اس کی کمر سے پتلی سی رسی بندھی ہوئی تھی، جس کے پچھلے سرے پر وہ گاڑی پھنسی ہوئی تھی، آدمی اسی کاہلی سے سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا، پھر گاڑی سامنے آئی جس کے رنگین شیشوں کے اندر دو کبوتر اور ایک گوریا بند تھے، کبوتر تو سر نہوڑے ایک طرف کھڑے تھے یا پھر دھیرے دھیرے کاہلی سے سر قدمی کر رہے تھے لیکن گوریا تیزی سے اِدھر اُدھر پھدکتی پھر رہی تھی اور قدرے اضطراب کے عالم میں تھی۔

اب گاڑی بیچ چوراہے پر آ گئی تھی، دھوپ آج کے روز نسبت خاصی سخت تھی اور گاڑی گھسیٹنے والا ہاتھ کو آنکھوں کے اوپر چھجے کی شکل میں کیے آس پاس متجسس نظروں سے جھانکتا پھر رہا تھا، پھر وہ ٹھہر گیا، سامنے نالی کے کنارے پر ایک پرندہ پیاس سے بے حال جھک جھک کر نالی سے پانی پی رہا تھا اور گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہا تھا، اسے کسی بات کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا، جبھی گاڑی کھینچنے والے آدمی نے بانس والے ساتھی کو اشارہ کیا، بانس والے نے چپکے سے، لپک کر پرندے کو جا لیا۔

ذرا دیر بعد جب اس نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے دروازے کا پٹ کھولا اور دھیرے سے پرندے کو اندر دھکیل دیا، پرندہ ایک طرف کو لڑھک گیا تو، پھدکتی ہوئی گوریا ایک بار زور سے گاڑی کے اندر شیشوں پر پھر پھڑانے لگی گویا بند شیشوں کو توڑ کر نکل بھاگے گی۔ بانس والے آدمی نے مسکرا کر شیشوں کے اندر جھانک کر دیکھا، اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک آ گئی پھر اس نے شیشے پر ہلکے ہلکے تھپکیاں دیں، یوں گوریا سہم کر ایک طرف ہو گئی۔

اس کے بعد ویسے ہی ہلکی چال سے گاڑی آگے بڑھی، گھنٹیوں کی آواز خاموش فضا میں سُنائی دی، ٹن ٹن ٹن... ٹن ٹن ٹن...

ذرا دیر بعد گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"گئی، چلی گئی..."

"ہاں چلی گئی۔ اس پرندے کو بھی لے گئی۔۔۔" جب فضا کا سحر ٹوٹا تو گاڑی اتری علاقے کے سخت ڈھلان میں اتر چکی تھی۔ اور اب دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی، فقط اس کے پہیوں سے اُڑتی ہوئی دھول تھی، جو دھیرے دھیرے فضا سے ہاتھ چھڑا کر بیٹھ رہی تھی۔ پھر چند منٹ بعد تماش بینوں کے چہروں پر جو حیرت کے اثرات تھے، وہ زائل ہو گئے اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

"اچھا بھائی جان۔۔۔ یہ پرندے والی گاڑی۔۔"

سوال کرنے والا رُک گیا اور خاصی دیر تک رکا رہا تب میں نے پلٹ کر دیکھا، ٹھیک میری پشت پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا، میری طرف مجسم سوال بنا تک رہا تھا۔

"یہ پرندے والی گاڑی۔" وہ لڑکا اتنا کہہ کر پھر رُک گیا، جیسے اسے خود پتہ نہیں کہ کیا پوچھنا ہے۔

"ہاں ہاں۔۔۔ میاں کیا پوچھنا چاہتے ہو پرندے والی گاڑی کے متعلق۔۔"

"جی بھائی جان اتنا کہ ——— یہ کیا گاڑی ہے پرندے پکڑنے والی۔۔۔؟"

"ہاں میاں ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا گاڑی ہے، ہر روز دوپہر میں آتی ہے اور شہر کے جتنے پرندے ہاتھ آتے ہیں سمیٹ کر چل دیتی ہے۔"

"اچھا بھائی جان۔۔" ذرا دیر بعد اس لڑکے نے یوں چونک کر سوال کیا گویا اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "اچھا بھائی جان۔ کیا یہ لوگ باجی کے نقا کو بھی لے جائیں گے؟"

"ہاں ضرور لے جائیں گے، دیکھنے کی دیر ہے۔۔"

"پھر باجی اچھی کیسے ہوں گی، انھیں لقوہ ہو گیا ہے نا۔ حکیم جی نے کہا تھا دواؤں کے ساتھ نقا کبوتروں کے پروں کی ہوا بھی چاہیے۔"

لڑکے نے بڑی حسرت سے کہا، یوں کہ میں اس کے افسردہ چہرے کی طرف یک ٹک دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں، بات تو ہے سوچنے کی، نقا کبوتر کو نہیں جانا چاہیے۔۔"

"پھر میں کیا کروں، آپ ہی بتائیے بھائی جان۔۔۔ میں تو بہت چھوٹا ہوں نا میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میری بھی سمجھ میں نہیں آتا میاں ——— اور سچ پوچھو تو میں بھی بہت چھوٹا ہوں۔"

"آپ چھوٹے ہیں۔۔۔" وہ لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا، آپ اتنے بڑے ہیں، واہ۔۔۔ وہ لڑکا پھر قہقہے لگانے لگا۔

میں خاموشی سے بدستور اسے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہا، میاں تم ہنس رہے ہو؟

"بھائی جان ایک اور بات پوچھوں؟" اس نے ذرا ٹھہر کر دوسرا سوال کیا۔

"پوچھو میاں وہ بھی پوچھ ڈالو۔۔۔"

"آپ اتنا اداس۔۔۔ بھائی جان آپ کبھی ہنستے کیوں نہیں؟"

میرا جی چاہا سچ سچ کہہ دوں، کیسے ہنسوں میاں، اس کارگہ شیشہ گری میں ہنسنا کوئی کھیل ہے، مگر میں اس معصوم بچے کو جو ذرا دیر پہلے لقا کبوتر کے چلے جانے کی فکر میں اُداس تھا اور اب ذرا دیر میں قہقہے لگا رہا تھا کچھ نہیں بتا سکا۔ نمخا پیار سے مجھے دیکھتا رہا۔

"بھائی جان میں آپ کو ہنسا دوں۔۔۔؟" وہ لڑکا بڑی محبت سے میری طرف بڑھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔۔۔ "آپ کہیے تو میں آپ کو ہنسا دوں؟"

پہلے تو میں چونکا، دفعتاً مجھے عجیب سا لگا، نا سمجھی میں اس لڑکے نے ذرا اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی تھی، پھر میں نے ذرا محبت سے تاکید کی:

"میاں آہستہ بولو، دھر لیے جاؤ گے، کسی نے سن لیا تو، پولیس والوں کو خبر کر دے گا کہ یہ کیسا لڑکا ہے کہ اس کی بہن بیمار پڑی ہے اور اس کا لقا کبوتر بھی چلا جانے والا ہے، اور یہ ہے کہ خود ہنستا بھی ہے اور دوسروں کو بھی ہنسانے کی سوچتا ہے، ہوش کے ناخن لو میاں، مفت میں پکڑے جاؤ گے۔"

"بلا سے پکڑ لیا جاؤں گا، لڑکے نے حوصلے سے کہا، آپ کہیے تو ہنسا دوں آپ کو۔"

"ہنسا دو میاں بڑا کرم ہو گا، بڑی مہربانی ہو گی تمھاری۔۔۔"

"تو پھر دوستی کیجیے۔۔۔" اس نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"تم سے دوستی؟ ارے چھٹنکی، تمھارے اتنے تو میرے بیٹے ہیں، میں تو تمھارے باپ کے برابر ہوں۔"

"تو کیا ہوا، باپ بھی تو دوست ہوتے ہیں۔ میرے مولوی جی کہتے ہیں۔ اچھے باپ اپنے بچوں کے دوست بھی ہوا کرتے ہیں۔"

"یہ بات ہے۔۔۔ تو ہوا دوست تمھارا آج سے۔" میں نے اس کے ننھے سے خوبصورت

ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

"پھر چلیے میرے ساتھ ندی کی طرف، وہاں آپ اور ہم دو ہی ہوں گے۔ وہاں میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں گا۔"

اور وہ لڑکا گھسیٹتا ہوا مجھے ندی کی طرف لے چلا، میں پیچھے پیچھے اور وہ آگے آگے، راہ گیر پلٹ پلٹ کر ہماری دوستی کو دیکھتے رہے اور ہم پلٹ پلٹ کر راہ گیروں کو تک رہے تھے۔ جن کے کوئی دوست ننھے بھی یا نہیں، جن کے کوئی ایسے پیارے بیٹے تھے بھی یا نہیں، اور یوں جب ہم ندی کے قریب پہنچے تو اس نے پہلے تو چالاک نگاہوں سے دائیں دیکھا بائیں دیکھا، ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے اپنے نیکر کی جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی، مسکرایا میری طرف پلٹا اور گہری سرگوشی میں بولا، "اس میں ہے"۔۔۔!

جواب میں میں نے بھی اتنی ہی ہوشیاری سے پہلے بائیں طرف دیکھا دائیں طرف دیکھا، جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اتنی ہی سرگوشی میں پوچھا:

"کیا ہے اس میں؟"

"یہ ہے، ۔۔۔ یہ ہے اس میں،" لڑکے نے کہا اور جھٹ سے ماچس کے اندرونی حصے کو باہر دھکیل دیا۔

ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش رنگ سی تتلی نیم جان سی پڑی تھی، جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے ہی پھڑپھڑانے لگی۔ اس کے ننھے ننھے پروں کے اردگرد زعفرانی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ اور پروں کے درمیان عین زیرہ کے برابر سرخی تھی۔ اور سرخی کے چاروں طرف گلابی رنگ سا چھلکا ہوا تھا اور پروں کے کنارے پر افشاں چمک رہی تھی۔۔۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بے حد حسین دکھ رہی تھی۔

میں تتلی کو غور سے دیکھتا رہا۔ اور ذرا دیر رنگوں کی دنیا میں کھویا رہا۔۔۔ جب تک میں رنگوں میں ڈوبتا ابھرتا رہا، وہ لڑکا اتنے ہی انہماک سے میرے چہرے کے خط و خال پر کچھ ڈھونڈتا پھرا۔۔۔ میں نے تتلی کی طرف سے نظر اٹھائی، اس لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ قدرے افسردگی سے میری طرف پلٹا۔۔۔ "آپ تو عجیب ہیں بھائی جان۔۔۔ آپ تو تتلی دیکھ کر بھی خوش نہیں ہوئے۔"

"ہاں میاں۔۔۔" میں چونک اٹھا۔ اس دس برس کے بچے نے تو مجھے بہت دور پہنچ کر

پکھڑ لیا ـــــــــ یہ تم نے کیا کہہ دیا میاں کہ میں۔۔۔"

"ہاں، بھائی جان۔۔۔" اس نے قطعہ کلام کرتے ہوئے کہا۔۔۔ آپ تو تتلی سے بھی خوش نہیں ہوتے، کیسے ہماری دوستی نبھے گی۔۔۔"

"نہیں نبھے گی میاں، کبھی نہیں نبھے گی۔۔۔"

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، مگر ساتھ ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے وہ لڑکا بھی ہم راہ رہا۔۔۔

"لیکن بھائی جان وہ میرا لقا کبوتر، وہ گاڑی۔۔۔"

دوسرے دن میں بازار کے سارے لوگوں سے کہتا پھرا، جوتے گانٹھنے والے موچی سے، کپڑا بیچنے والے بزاز سے، بھیڑ میں گھرے رہنے والے ڈاکٹر سے، روٹی اور دال بیچنے والے سے، راہ گیروں سے، سفید پتلون والے تیز رفتار بابو سے، بوجھ ڈھونے والے قلی سے، رنگین دوپٹے والی خاتون سے جو سڑک پر ہولے ہولے یوں چلتی ہے گویا سارے زمانے کو روند کر گزر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، دونوں سیاست دانوں سے، جو آپس میں سازشی انداز کی گفتگو میں مصروف لپکے چلے جا رہے تھے۔ ایک ایک آدمی سے پوچھتا پھرا، تیز رفتار گاڑیوں کو روکنے کی ناکام کوشش کی، کہ اس دس سالہ بچے کی جوان بہن لقوہ کی مریض ہے اور حکیم جی نے دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا کے لیے کہا ہے۔ اگر یہ گاڑی والے بچے کے کبوتر کو بھی لے گئے تو پھر کیا ہوگا؟

مجھے کسی نے جواب نہیں دیا، سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف رہے، اس لیے میں دس سالہ بچے کے سوال کو پی گیا۔ اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ مجھے افسوس تھا، اداس سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ میرے پاؤں تھک گئے تھے۔

دوپہر سے شام ہونے کو آ گئی تھی، سُرمئی اندھیرے کا جنم ہونے والا تھا کہ میری نظر چوک کے ایک کوٹھے پر گئی، جہاں شہر کی مشہور رنڈی مُنّی بائی بالکونی میں کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ مُنّی بائی کے سامنے اڈے پر اس کا طوطا دائیں بائیں گردن گھما گھما کر جھوم رہا تھا۔ اور وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتی جا رہی تھی۔ اور طوطے کو پڑھاتی بھی جا رہی تھی۔

میں چپکے سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اس کے کمرے کو عبور کر کے بالکونی میں عین مُنّی بائی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ مُنّی بائی میری آواز سے مطلق بے خبر طوطے کو پڑھانے میں محو تھی۔ وہ بول میاں مٹھو، نبی جی روزی بھیجو۔۔۔"

میاں مٹھو نے اڈے میں دائیں اور بائیں جانب رکھی ہوئی دونوں پیالیوں کو گردن گھما

کر دیکھا، پھر ایک پیالی پر جھک کر ہری مرچ کو کتر کر، منّی بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولا، نبی جی روزی بھیجو... نبی جی روزی بھیجو...۔"

"نبی جی روزی بھیجو۔" طوطے نے اسی طرح اکڑ کر کہا۔

"سو میں آ گیا۔" اس کے پیچھے کھڑا میں نے آہستہ سے کہا۔ منّی بائی سُن کر چونک اٹھی، اس نے پلٹ کر مجھے گھورا ذرا دیر کو سہم گئی، پھر ذرا ڈپٹ کر بولی:

"تم کیسے چلے آئے جی، کون ہو؟"

"سیٹھ بھیموں سے جی، مجھے نہیں پہچانا منّی بائی، مجھے نبی جی نے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"

منّی بائی یہ سُن کر ہنس پڑی۔ "اچھا اچھا جی، چلو ادھر بیٹھو تخت پر۔" اس نے کنگھی کے دانتوں سے سنہرے بالوں کا گچھا نکالا۔ اس نے گولی بنا کر اس پر تھوکا پھر نیچے سڑک پر پھینک دیا۔

"بڑی طوطا چشم ہو منّی بائی ذرا سا میں طوطے کی طرح رنگ بدلتی ہو۔" جواب میں منّی بائی نے ایک اور رنگ بدلا اور مسکرا پڑی۔

تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے اس کے قدموں پر چودہ روپے کے ایک ایک کے نوٹ رکھ دیے

"میرے پاس اتنے ہی ہیں جی۔ تمھارے نبی جی نے آج بڑے غریب آدمی کو ادھر بھیجا۔"

"نہیں جی یہ بھی کیا کم ہیں... ہم تو اپنے آقاؤں کی خدمت کرنا جانتے ہیں۔"

لیکن بہت دیر ہو گئی اور میں نے منّی بائی سے کوئی خدمت نہیں لی تو وہ جھلّا گئی۔ "یہاں کاہے کو آئے ہو جی... اور یہ روپے کیوں دیے...؟"

"منّی بائی بُرا نہ مانو، میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ تم سے بھی پوچھ دیکھوں، تم کیا کہتی ہو؟"

"کاہے کے بارے میں؟"

"یہ جو آج کل ہر روز دوپہر میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اس کو دیکھتی ہو؟"

"ہاں دیکھتی ہوں کبھی کبھی۔"

"تو تمھیں کیسا لگتا ہے...؟"

"اچھا جی... اچھا لگتا ہے... پیلے پیلے لال لال خوب صورت شیشوں میں سے پرندے چہکتے ہوئے بھلے دِکھتے ہیں۔"

"بہت دُور سے دیکھتی ہو نا... جتنی دُور سے تمھیں تمھارے چاہنے والے دیکھتے ہیں۔"

"ہاں جی، اس بالکونی سے ..."

"منّی بائی، کسی دن نیچے جاکر قریب سے دیکھو ..."

"وہ کیوں، مجھے اتنی فرصت نہیں جی۔" منّی بائی نے ناگواری سے میری اور دیکھا، پھر غالباً اسے میرے چودہ روپے کے نوٹ یاد آگئے تو وہ مسکرا پڑی۔ "تم مجھے ذرا قریب سے دیکھو ناجی ...؟"

"سو تو دیکھ ہی رہا ہوں منّی بائی اور تم بھی دیکھ لوگی جس دن گاڑی والے تمھارے طوطے کو پکڑ کر لے جائیں گے ..."

"میرے طوطے کو کیوں لے جانے لگے۔" منّی بائی نے کڑک کر برجستہ کہا، یہ کوئی سڑک پر پھرنے والا آوارہ پرندہ ہے، یہ تو پالتو ہے میرا ہیرامن۔"

"ہاں منّی بائی پہلے تو سڑک پر پھرنے والے پرندے کو پکڑیں گے پھر ... کچھ دنوں کے بعد ... لال لال پیلے پیلے خوب صورت شیشوں کے پیچھے سے اور پرندوں کے درمیان یہ تمھارا ہیرامن طوطا دیکھنے میں کتنا اچھا لگے گا، تم دیکھو نہ دیکھو سڑک پر چلنے پھرنے والے لوگ باگ اور دکان میں سودا سلف بیچنے والے بنیئے ضرور دیکھیں گے۔ اور سڑک پر، جو پرندے والی گاڑی والے دونوں آدمی سکّے پھینک دیتے ہیں، ان سکّوں کو اور لوگوں کے ساتھ تم بھی چننے لگو گی اور یہ بھول جاؤ گی ... کہ ..."

"کیا بھول جاؤں گی ...؟" بہت سے سکّے مل جائیں تو ہیرامن کو کون روتا ہے۔ گاڑی والے اگر ڈھیر سارے سکّے پھینک دیں گے تو میں سب چن لوں گی ... اور بازار سے نیا طوطا لے آؤں گی۔"

اے ہے منّی بائی، ہوش کے ناخن لو، یہ دنیا ہے اور دنیا سالی بڑی مطلبی ہوتی ہے۔ مان لو، بازار میں طوطا نہ ملا، اور ملا تو ایسا پڑھنے والا نہ ملا۔ اور یہ پڑھنے والا بھی مل گیا تو اس کی زبان میں یہ تاثیر ...

منّی بائی

منّی بائی

منّی بائی کھِلکھِلا کر ہنس پڑی، اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی:

"واہ بہت اچھا بولتے ہو جی، کہاں رہتے ہو؟ ... کیا کام کرتے ہو؟"

"کہانیاں لکھتا ہوں منّی بائی، رہتا وہتا کیا، جہاں پایا رہ لیا، جہاں چاہا سو لیا۔"

"اے کہانیاں لکھنا بھی کوئی کام ہوا، لگتا ہے تم تو ہم سے بھی گئے گزرے ہو... تمھارا دھندہ تو ہمارے دھندے سے بھی گیا گزرا لگتا ہے جی... کیوں جی۔"

"ہاں منّی بائی، تم تو ذرا سا ہیں اکٹھے چودہ روپے رکھوا لیتی ہو اور مجھے چودہ روپے حاصل کرنے کے لیے آٹھ کہانیاں لکھنا پڑتی ہیں۔ دو روپے فی کہانی کے حساب سے جریدے والے نے دیے ہیں۔"

دو روپے فی کہانی... یہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔ منّی بائی نے مایوسی سے کہا، اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی، دو روپے فی کہانی کے حساب سے آٹھ کہانیوں کے سولہ روپے بنتے ہیں... باقی دو روپے بھی نکالو جی... جلدی کرو۔"

"ہاں جی، بنتے تو سولہ ہی روپے ہیں، مگر ایک کہانی تو ناپ تول میں چلی گئی۔"

"ناپ تول میں؟ ارے واہ۔" منّی بائی پھر ہنسی۔ "ناپ تول میں کیسے چلی گئی؟"

"وہ ایسے کہ جب جریدے والے کے پاس پہنچا اور اسے آٹھوں کہانیاں پڑھائیں تو وہ جھٹ اندر سے ترازو لے آیا۔"

"ترازو؟ کہانیاں تول کر بکتی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے منّی بائی ابھی تک تو تول کر بکتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد دیکھنا بے تولے ہی بیچنا پڑیں گی۔"

"اچھا اچھا پھر وہ ترازو لے آیا..." منّی بائی نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں ترازو لے آیا، ڈنڈی ملائی تو ایک طرف پاسنگ تھا۔ اس نے جھٹ آدھی کہانی نوچ لی اور دوسری طرف والے پلڑے پر رکھ دی، جب پاسنگ برابر ہو گیا، ایک طرف وزن کے سات پتھر رکھے اور دوسری طرف ساڑھے سات کہانیاں۔"

"میں نے کہا وزن کے سات ہی پتھر رکھے گئے ہیں، دیکھو تو کہانی والا پلڑا کتنا جھک آیا ہے ——— آدھی کہانی تو تم نے پہلے لے لی..."

"پہلے لے کر آدھی کہانی کیا میں کھا گیا، پاسنگ نہ ملاتا ترازو کا؟" جریدے والے نے چڑھ کر کہا۔

بات سچ تھی، میں نے جلدی سے کہا "اچھا ٹھیک ہے، تم سچ کہتے ہو، یہ دوسری طرف کا پلڑا جو اتنا جھک آیا ہے۔ منّی بائی، یہ سُن کر جریدے والا بگڑ گیا۔ ترشی سے کہا، اتنا

جھک گیا تو دم نکل گیا تمھارا، کیا سونا تول رہے ہو، کہانیاں ہی تو ہیں۔"

"سچ ہی کہا جمیدے والے نے۔" منی بائی نے ہمدردی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے دل برداشتہ دیکھ کر منی بائی نے دکھ سے کہا، واقعی ہمارا دھندہ تمھارے دھندے سے بہت اچھا ہے۔

"ہاں منی بائی بہت اچھا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کاغذ، قلم پھینک تمھارا والا دھندہ ہی شروع کر دوں۔"

یہ سن کر منی بائی بے ساختہ ہنس پڑی اور جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھک لیا۔

"اللہ، ایسا نہ کر بیٹھنا جی، ورنہ مفت میں ہماری روٹی ماری جائے گی۔"

بہت دیر تک ہنستے رہنے کے بعد جب منی بائی تھک گئی تو اسے کچھ یاد آیا۔

"اچھا جی، ایک کہانی ہم پر لکھو۔۔۔"

"نہیں منی بائی، تم پر تو بہتوں نے کہانیاں لکھی ہیں۔ میں تو تمھارے طوطے پر ایک اچھی سی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔"

"لکھو جی، ضرور لکھو ——— میرے طوطے پر ہی لکھو۔۔" منی بائی نے مسرت سے کہا، مگر کیا لکھو گے؟"

"یہ لکھوں گا کہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آگئی ہے، اور اب، جب بازار کے سارے پرندے ختم ہو چکے ہیں رنگین شیشوں سے گھری ہوئی گاڑی والے دونوں زہریلی آنکھوں والے آدمی چاروں اور گھور گھور کر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے کوئی پرندہ ہاتھ آجائے، کہیں سے کوئی کوک، نیل کنٹھ، کوئی مینا، کوئی طوطا دکھائی پڑے، اتنے میں ان کی چاروں زہریلی نگاہیں تمھارے طوطے پر پڑتی ہیں اور وہ دونوں کھل اُٹھتے ہیں پھر لمبے بانس والا آگے بڑھتا ہے اور چپکے سے طوطے کے بائیں بازو پر لس دار رطوبت والے گچھے کو چھوا دیتا ہے، طوطا پھڑپھڑاتا ہے، تھرتھراتا ہے، اُڑنے کی کوشش کرتا ہے اور برسوں کے اڈے کو غیر محفوظ جان کر بالکنی کی ریلنگ کا سہارا لینا چاہتا ہے، مگر نہیں لے پاتا، اور تڑپتا ہوا نیچے آرہتا ہے۔ جہاں وہ آدمی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ لپک کر طوطے کو اٹھاتا ہے، طوطا۔۔ چیں۔۔۔ں ں۔۔۔ کی آواز سے زور سے چیختا ہے، پھڑپھڑاتا ہے، پھر تھے نہیں اس کی ساتھ چھوڑتی ہوئی قوتِ پرواز کہاں سے لوٹ آتی ہے وہ خود اُوپر اُڑتا ہے لیکن

پھر گر پڑتا ہے۔

وہ آدمی جس کی کمر سے گاڑی والی رسّی بندھی ہوتی ہے، اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے مسکرا دیتا ہے، جس کے جواب میں اس کا رفیق پہلے اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے، پھر فرش پر ہانپتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتا ہے۔ اور آہستہ سے آگے بڑھ کر طوطے کو اٹھانے کے لیے جھکتا ہے...

لیکن دفعتاً طوطا اس کی گرفت میں آنے کی بجائے تڑپ کر اچھلتا ہے اور اس کی کنپٹیوں پر جھپٹتا ہے اور گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے۔

اس آدمی کے منہ سے چیخ نکلتی ہے، جسے سُن کر اس کا دوسرا ساتھی لپکتا ہے اور طوطے کی گردن پر ہاتھ ڈالنا ہی چاہتا ہے کہ طوطا گھور کر دوسرے آدمی کو دیکھتا ہے، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور اس میں لہو اتر آتا ہے، وہ اپنی پوری طاقت کو سمیٹتا ہے اور لپک کر دوسرے آدمی پر بھی حملہ کرتا ہے اور اس کے سارے چہرے کو نوچ کر لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ آدمی بھی جھلا اٹھتا ہے، اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے طوطے کو الگ کرتا ہے اور اسے زور سے زمین پر پھینک دیتا ہے۔

اب دونوں طوطے کے اطراف کھڑے حیرت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور طوطا آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کبھی پہلے آدمی کی طرف جاتا ہے، پھر اسی اطمینان سے ٹہلتا ہوا دوسرے آدمی کی طرف لوٹ جاتا ہے، اور دونوں کو اپنی خوں آشام نظروں سے گھور رہا ہوتا ہے...

... "اور اتنے میں"، منّی بائی جلدی سے کہہ اٹھتی ہے۔ "میں لپک کر جاتی ہوں اور اپنی چادر اس پر ڈال دیتی ہوں اور پرندے کو پکڑ کر گاڑی والے کے حوالے کر دیتی ہوں۔ اور اس سے بہت سے..."

"... جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا میں طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی..؟"

منّی بائی حقارت سے میری طرف دیکھتی ہے، اور تھوک دیتی ہے "ایسی ہی کہانی لکھی جاتی ہے... جی؟"

جواب میں میں منّی بائی کے چہرے کو دیکھتا ہوں، اڈے پیا دھرسے ادھر تے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہوں اور پھر ایک بار پلٹ کر طوطے کو دیکھتا ہوں...

پھر گاڑی والے منّی بائی کے نبی جی سے "روزی بھیجو"، کی محنت کرنے والے طوطے

کو بھی لے جاتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ شہر سونا ہو جاتا ہے، کہیں کوئی پرندہ، کوئی گوریا، کوئی بلبل مینا، طوطا، کوئی مرغ، کوئی فاختہ نظر نہیں آتی۔

شام ڈھلے درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی، لاجوردی آسمان پر سفید بگلے توازن سے اڑنے والے بگلے بھی نہیں دکھائی دیتے، بھری دوپہر کی خاموش فضا میں چیلوں کی درد بھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی۔ کبوتر کی غٹرغوں، پپیہے کی پی کہاں پی کہاں، مینا کی ٹوئیں ٹوئیں کی آواز سے کان محروم ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مرغ کی اذان بھی کہیں کھو گئی ہے۔

لیکن بازار اور رونق بازار میں کوئی فرق نہیں آتا، خرید و فروخت جاری ہے، شور شرابہ، یکہ والوں کی کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والوں کے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں، لمبی اور خوب صورت کاریں زوں زوں کر کے گزر جاتی ہیں۔ آمد و رفت جاری ہے، کاروبار بدستور ہے، خریدنے والے اسی طرح بازار کی دکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والے اسی انہماک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے، ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔

پھر دن ڈھلتا، پھر رات آتی ہے اور اپنے تمام چھوٹے بڑے کھرے کھوٹے سچے جھوٹے بچوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے، پھر رات بھی چلی جاتی ہے، پھر صبح نمودار ہوتی ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے۔

اب پرندہ پکڑنے والی گاڑی کم آتی ہے۔ دو چار دنوں میں، آٹھ دس دنوں میں، پندرہ بیس دنوں میں ایک بار آتی ہے، رنگین شیشوں میں سے ایک آدھ پرندہ، حیرت سے بازار والوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ گاڑی والے ادھر ادھر تیز نگاہوں کا جال پھینکتے، پھر سمیٹتے اور چاروں متجسس نظروں سے دیکھتے، ڈھونڈتے ڈھانڈتے آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کچھ ملتا ہے کبھی کچھ نہیں ملتا، کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ایک ایسا ہی دن تھا، دھوپ بہت سخت تھی، ہوا گرم تھی، فضا میں دھول اڑ رہی تھی جھکڑ چل رہے تھے، جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح گرم گرم ہوا پھینک رہی تھی، کہ گاڑی آگئی۔

گاڑی آگئی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی آگئی . . .

گاڑی عین چوک پر کھڑی ہو گئی۔ رنگین شیشوں کے اندر ایک ہی پرندہ تھا، جو ادھر

ادھر سہمے سہمے قدم رکھتا ٹہل رہا تھا، اس کی دم مور کی طرح کھلی تھی اور آنکھوں میں افسردگی جھلک رہی تھی، ابھی گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ دوڑتا ہوا وہ دس سالہ بچہ آ پہنچا، اس نے پہلے گاڑی والوں کو دیکھا، پھر شیشے کے اندر جھانک کر دیکھا، ذرا دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد دفعتاً اس نے لپک کر شیشے کے چھوٹے سے دروازے کو کھول دیا۔

اتنی ہی پھرتی سے بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ پھر دروازے کو بند کر دیا اور جیب سے بہت سارے سکّے نکال کر سامنے اچھال دیے۔ لڑکے نے سکّوں کی طرف دھیان نہیں دیا، بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اسے ایک طرف دھکا دے دیا اور سکّے اچھال دیے، لڑکے نے سکّوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ گاڑی تیزی سے چلنے لگی، اس کے پیچھے پیچھے بانس والا آدمی تیز تیز قدموں سے چلنے لگا پھر گاڑی اور تیز ہوگئی، آدمی کے قدم بھی تیز ہوگئے، اب وہ دوڑنے لگا۔

لڑکا کچھ دیر خاموش، حیرت اور افسردگی سے تکتا رہا پھر جانے کہاں سے اس کے قدموں میں بجلی کی سی جھپٹ آگئی، اس نے دہل کر بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھا، پھر دوڑتا ہوا اسے جا لیا اور شیشوں پر زور سے گھونسہ مارنے والا ہی تھا کہ بانس والے آدمی نے اس کے وار کو اپنے ہاتھ پر روک لیا، اور بچے کو زور سے . . . بہت زور سے دھکا دیا۔

لڑکا گیند کی طرح سڑک پر لڑھک گیا۔ اس کے سر اور گھٹنوں پر سخت چوٹ آئی، اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، اور دیر تک وہ سڑک کو تاکتا رہا، پھر جب اس کی بینائی پر چھایا ہوا اندھیارا ہٹا اور اس نے غور سے دیکھا تو گاڑی دور ڈھلان پر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی، اور اس کے پیچھے صرف دھول ہی دھول تھی۔

لڑکے نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اُٹھا نہیں گیا، اس کے گھٹنوں کے درد نے اُٹھنے نہیں دیا اور وہ پھر تلملا کر سڑک پر گر گیا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، گاڑی میں لگی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی سحرزدہ آواز کانوں سے اوجھل ہوگئی، اور بہت دیر ہوگئی . . . بہت . . . بہت دیر۔

جب بہت دیر ہوگئی تب وہ لڑکا سڑک پر سے اُٹھا، پہلے اس نے اپنے لہولہان گھٹنوں کو دیکھا۔ پھر اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑی اس کے بعد اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے چل کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

"بھائی جان لقا بھی چلا ۔ ۔ ۔" اس نے گویا اپنے آپ کو اطلاع دی۔

"ہاں میاں، لقا بھی چلا گیا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

ذرا دیر تک وہ سڑک کی اور دیکھتا رہا، اس کی نظریں ڈھلان کی طرف دوڑ گئیں۔ جہاں کچھ بھی نہیں تھا، اس نے دھیرے سے اس نیکر کی اس ابھری ہوئی جیب پر ہاتھ پھیرا جہاں ماچس کی ڈبیہ تھی۔

"بھائی جان ۔ ۔ ۔ اس، اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نا؟"

. . . .

جب تتلیاں بھی چلی گئیں تو کیا بچے گا شہر میں؟؟

جواب میں میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، جہاں آنسوؤں اور سڑک کی دھول کے ملے جلے نشان تا حال مایوسیوں کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا چونکا اور اس نے سامنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا:

بھائی جان، بھائی جان وہ دیکھیے ۔ ۔ ۔

عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نہوڑے بیٹھا ہوا تھا ۔ ۔ ۔ میری اور اس دس سالہ معصوم بچے کی نگاہیں دیر تک پتھر کے اس پرندے پر ٹکی رہیں۔

○○

دیویندر اسر

مردہ گھر میں میری لاش پڑی ہے۔

مال گاڑی سے اُتاری گئی۔ بند بوریوں سی پھولی، لیبل لگی تین چار لاشیں اور بھی مردہ گھر میں پڑی ہیں۔

جب میری لاش مردہ گھر میں لائی گئی تو سورج دھیرے دھیرے دور ٹیالی پہاڑیوں کی اوٹ میں پھسل رہا تھا اور پہاڑی پر ٹکے بادلوں میں آگ کے گولے کی لال کرنیں شعلہ سی بھڑک رہی تھیں۔ افق سے لوٹی ہوئی لالی بند کھڑکی کے شیشوں میں جلتے لوہے سی پگھلنے لگی۔ دھند اور مٹی کے غبار میں اندھیرے کے ذرّے تیر رہے تھے اور میں پہچان نہ سکا کہ مجھے مردہ گھر میں کون لایا ہے۔ سایے دھیرے دھیرے روشنی کو نگلنے لگے اور پھر روشنی اور سایے کا فرق

مُردہ گھر

مٹ گیا۔ کمرے میں اندھیرا کالے ناگ کی طرح رینگ رہا تھا۔ سرخی سیاہ ہو چکی تھی۔ آگ کا گولا اندھیرے کے غار میں ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا سرکتے سرکتے بہت قریب آکر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ لاشوں کے سفید کفن بھی سیاہ پڑ گئے۔ مردہ گھر، برگد کا بوڑھا پیڑ، بجلی کا کھمبا، اسپتال کی وسیع عمارت، سامنے نرسوں کے کوارٹر، سڑک، گھاس، پھول، کانٹے دار تاریں، سائیکل اسٹینڈ، مریضوں کے کمرے، حد بندی کی دیوار ——— سب پر موت کی کالی چھایا پھر گئی۔ مریض وارڈوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے ملنے والے گھر لوٹ گئے۔ ایمبولنس وین اور مردہ گھر کی گاڑی یتیموں سی کھڑی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کراہ لیتا تھا۔ لوٹتا ہوا پرندہ پر پھڑپھڑا لیتا تھا۔ ہارن بجانا منع تھا لیکن دور سے اس سنّاٹے میں سُنائی دے جاتا تھا۔

قریب کسی کے قدموں کی آواز سنائی پڑی۔ شاید کوئی لاش اور لائی جا رہی تھی۔

لیکن آواز آگے بڑھ گئی اور کُتّا آواز کے پیچھے دیر تک بھونکتا رہا۔ درختوں کے پتّے گر رہے تھے۔
سوکھے کھڑکھڑاتے پتّے۔ اور تیز ہوا ٹہنیوں میں گولی کی آواز کی طرح گونج رہی تھی۔

اور پھر آوازیں دھیرے دھیرے سنّاٹے میں کھو گئیں۔ ایسے میں کوئی پتّا بھی گرتا تو میں سہم جاتا۔

مردہ گھر کے دروازے کی درز سے روشنی کی ایک لکیر نہ جانے کہاں سے آجاتی اور جب وہ بھی غائب ہوجاتی تو اندھیرا اور بھی گہرا ہو جاتا۔ میں مر چکا ہوں۔ پھر بھی نہ جانے کب سے ایک بے نام سا خوف میری روح میں گڑا جا رہا ہے۔ برگد کے پیڑ پر اُلٹی لٹکی چمگادڑوں کو دیکھ کر ایک بار لاشیں بھی کانپ جاتی ہیں۔ کوئی چمگادڑ جب مُردہ گھر کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف اُڑتی، ٹکراتی ہے تو کمرے میں اندھیرے کی بھٹکن اور بھی تیز اور گہری ہو جاتی ہے۔

میری موت کیسے ہوگئی؟ ابھی کچھ لمحے پہلے میں زندہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی زندہ ہوں کیونکہ میری لاش اب بھی سردی میں ٹھٹھر رہی ہے اور مجھے اب بھی کچھ کچھ یاد آتا ہے، کچھ کچھ، مدّھم مدّھم سا، موہوم سا کچھ۔

مجھے کوئی روگ نہیں ہوا، پیٹ پیٹھ پر کسی نے چھُرا نہیں گھونپا، دل دماغ میں کوئی گولی نہیں لگی، نہ حرکتِ قلب بند ہوئی نہ دماغ کی کوئی نالی پھٹی، نہ جسم جلا نہ دل سے درد اُٹھا، تو پھر میں اچانک مر کیسے گیا؟

ساتھ والی لاش نے شاید کروٹ بدلی۔ اب اس کے مرنے کا ایک سبب ہے، ایک سلسلہ ہے۔ شاید انسان کی مشیّت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ پہلے ہلکے ہلکے کھانسی ہوئی، پھر متواتر کھانسی آنے لگی، بخار بھی ہونے لگا۔ جسم دبلا نحیف، چہرہ پیلا زرد اور دل اُداس ہو گیا۔ پھر کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ اور جب خون آنے لگا تو وہ گھبرا گیا کہ اب وہ کسی دن کسی بھی لمحے مر سکتا ہے۔ اسے اندر ہی اندر کوئی کھا رہا ہے، کوئی گھن لگ گیا ہے۔ ویسے اسے کوئی بھی روگ ہو سکتا تھا۔ روگ کے انتخاب میں وہ آزاد نہیں تھا۔ ساتھ والے بستر پر پڑے پڑے اس نے ایک دن بتایا تھا کہ وہ برسوں سے اس روگ کو پال رہا ہے: بڑے پیار سے، بڑی رفاقت سے، ایسے ہی جیسے وہ کسی نظم کی تخلیق کر رہا ہے: بے اختیار، نامعلوم، بے ارادہ۔ اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ شعر کے ساتھ ساتھ دق کے جراثیم بھی

پال رہا ہے۔ جب لکھتے لکھتے اسے زوروں کی کھانسی ہوئی، پھیپھڑوں میں درد ہوا اور خون کا ایک کالا دھبّہ کورے کاغذ پر جا پڑا ——— ایک شعر کی تخلیق۔

——— اندھیرے کے خلا میں بھٹکتی ہوئی، آسیب زدہ نجس سایے سی زندگی۔

"شعر اور دق کے جراثیم شاید ایک ساتھ ہی جنم لیتے ہیں، ایک ساتھ ہی پلتے ہیں"، اس نے کہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا رومانٹک تصوّر تھا اس کا! جیسے تپ دق ہی شعر کا سرچشمہ ہے۔

ساتھ والے وارڈ میں کوئی یک بارگی کراہ کے ٹوٹ گیا۔

اس نے مجھے دیو مالا کا ایک قصّہ سُنایا:

"فیلو اسٹیٹس بڑا طاقتور تھا لیکن اس کے پاؤں میں ایک ایسا زخم تھا جس سے بڑی نفرت انگیز بدبُو آتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کے رِستے ہوئے زخم اور بدبو کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے پاس ایک کمان تھی جو دشمنوں کو فنا کر سکتی تھی اور جس کا نشانہ اچوک تھا، مگر اس کے زخم کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ بدبُودار رِستے ہوئے زخم کے باعث اس کے ساتھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے لیکن اپنے دشمنوں پر فتح پانے کے لیے انھیں اس کی ضرورت پڑی کیوں کہ صرف اس کے پاس ہی ناقابلِ تسخیر حربہ تھا۔" "لیکن اگر کسی کا زخم زیادہ گندا ہے تو کیا وہ اسی باعث بڑا فن کار ہے یا جس کی صلاحیت زیادہ ہے اس کا زخم بھی بڑا ہے؟"، میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر بولا:

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوال زخم کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کون زخم خوردہ ہے۔ ایک عام کند ذہن یا ایک مہا کوی۔"

اس نے کروٹ بدلی۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور خون کی ایک دھار اس کے پھیپھڑوں سے پھوٹ پڑی۔ اس نے نیم بند آنکھوں سے کمرے میں پڑے سب مریضوں کو دیکھا اور پھر سو گیا۔ نرس دیر سے آئی تھی اور وہ جا چکا تھا۔

آج اس نے اپنی پریم کہانی سُنائی تھی۔

چاندنی میں لپٹے ہوئے چیڑ کے درختوں سے ہوا گزرتے ہوئے رو رہی تھی۔

بے حسی مجھ پر طاری ہونے لگی - بس اتنا یاد ہے کہ سفید کپڑوں والی کوئی عورت ٹرالی میں دروازے کے سامنے سے گزر گئی -

وہ نہ تو شاعر ہے اور نہ ہی اختلاج قلب کی مریض - پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟ (لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کسی بھوت کا سایہ ہے -) جب بھی وہ کمرہ اور کھڑکیاں بند کرتی ہے اور پردے گراتی ہے تو اسے کوئی خوف جکڑ لیتا ہے - چاروں طرف خاموشی ہوتی ہے - مکمل سناٹا، لیکن وہ اس دیوار سے اس دیوار کی طرف بھاگتی ہے -

"تم کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ لو میں دروازے کھول دیتی ہوں - ایشور کے لیے باہر نکل جاؤ -" وہ چلاتی اور پھر دروازے اور کھڑکیاں کھول دیتی، پردے ہٹا دیتی اور ایک لمبی سانس لیتی اور صوفے پر مفلوج سی گر پڑتی - اُف - اور پھر جب وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کرتی اور پردے گرا دیتی، کمرے میں مکمل اندھیرا اور خاموشی ہو جاتے تو یہی ڈراما شروع ہو جاتا - وہ چلاتی : "میں پاگل ہو جاؤں گی -"

کیا وہ پاگل نہیں تھی؟ جیسے بند، اندھیرے کمرے میں کسی بھٹکتے ہوئے، آشیاں سے بچھڑے پرندے کے پر پھڑپھڑانے کی آوازیں آتی ہیں - جہاں جہاں وہ جاتی ہے یہ پرندہ اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے - وہ اس سے بھاگتی ہے، اس دیوار سے اس دیوار تک —— ایک ریستوران سے دوسری تفریح گاہ تک پہاڑی مقاموں پر، سمندر کے کنارے، سنسان ویران جگہوں اور بھرے پُرے بازاروں میں، لوگوں کے ہجوم میں، اکیلے —— یہ پرندہ اس کے شانے پر بیٹھا رہتا ہے - نہ اُڑتا ہے نہ مرتا ہے -

جب کیز یولیٹی روم میں اسے لے جا رہے تھے تو میں نے اسے دیکھا تھا : تازہ کھلے پیلے پھول کی طرح خوبصورت، کھوئی کھوئی سی، آنکھیں حیرت بھری، بکھرے ہوئے بال، جنوں خیز، خاموش، سنجیدہ —— اور جب اس نے ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھائیں تو اس کی روح کو کچھ سکون ملا - محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی - شاید اس کی نیند غائب ہو چکی تھی - ایک اٹوٹ نیند، عالمِ جذب کے لیے جس میں محض خواب ہے، حقیقت نہیں - شاید یہ موت انھیں خوابوں کے باعث تھی - مردہ گھر میں اس کی رُوح پریت سی گھوم رہی تھی، ایک بھٹکے ہوئے آشیاں سے بچھڑے پرندے کی طرح —— ایک دیوار سے دوسری دیوار تک -

"آج شام کو ملنا، سات بجے، ٹھیک سات بجے، پارک میں۔"

"او۔ کے۔" نرس نے ڈاکٹر کو جواب دیا اور مسکرا دی اور پھر مریض کو انجکشن لگانے میں لگ گئی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لوگ ایک چھلاوے سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟ اپنی زندگی ایک واہمے کے لیے کس طرح برباد کر دیتے ہیں!" نرس کہہ رہی تھی۔

"پُوور سول۔ کسی سے عشق وشق ہو گیا ہو گا۔" وہ بولی۔

میں نے کروٹ بدلی۔ کیا عشق کے بغیر انسان کی نجات نہیں؟

"سوال عشق یا خودکشی کا نہیں، سوال اس واہمے کا ہے جس کے لیے لوگ زندگی لُٹا دیتے ہیں۔" شاعر نے کہا تھا۔

"کیا حقیقت ہے اور کیا واہمہ؟ کیا صداقت ہے اور کیا شاعری؟ ان سوالوں کا جواب میں کیسے دے سکتا ہوں شاعر۔ نہ میں نے کبھی شعر کی تخلیق کی ہے نہ ہی کسی سے پیار۔ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔"

نہ جانے اس نیم شعوری حالت میں مجھے بچپن کی باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں!

میں چھت پر پتنگ اُڑا رہا تھا۔ پتنگ اُوپر ہی اُوپر اُڑتا جا رہا تھا، آکاش کے وسیع کھلے پن میں، جیسے وہ کسی ڈور سے نہیں بندھا محض ہوا کے دوش پر اُوپر ہی اُوپر اُڑ رہا ہے۔ ایک دوسرا پتنگ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ قریب آتے آتے ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔ ڈور ختم ہو رہی تھی۔ ڈر تھا کہ میرا پتنگ کٹ نہ جائے۔ میں نے ایک جھٹکا دیا، دوسرے کا پتنگ کٹ گیا۔ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ کٹا پتنگ بہت دیر تک ہوا میں تیرتا رہا اور ہم بہت دُور تک اس کے پیچھے بھاگتے رہے۔ پتنگ بیری کے ایک درخت پر کانٹوں میں اُلجھ گیا۔ جھٹ میں درخت پر چڑھ گیا۔ کانٹوں میں اُلجھتے میں نے پتنگ جھپٹ لیا۔ میرا جسم زخمی ہو چکا تھا، میرے کپڑے پھٹ گئے تھے لیکن جیت کے نشے میں میں نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ جب میں نیچے اترا تو ایک بھدا سا بڑا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ "یہ پتنگ میرا ہے!" اس نے کہا۔

میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں اُس سے کہا: "یہ میں نے جیتا ہے۔"

"دیتا ہے یا دوں ایک ——" اور اس نے مجھے ایک گندی گالی دی تھی۔ میں

نے دریوزہ گر نظر سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے اُٹھتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں کانپ گیا۔ میں نے پتنگ اسے دے دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک چوہا ہوں جو بلّی کے ڈر سے اپنے بِل میں گھس گیا ہے۔

اور پھر میں نے پتنگ اُڑانا چھوڑ دیا۔ ہر کھیل: گیند بلا، ہاکی، فٹ بال ـــــ سب کچھ چھوڑ دیا۔ ہر جگہ تو بڑا لڑکا تھا۔ میں اکیلا دُور نکل جاتا۔ ریل کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا اور پُلیا پر جا بیٹھتا۔ رنگ برنگی تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ میں گھنٹوں اسی طرح بھوکا پیاسا دُنیا سے بے خبر کالی، پیلی، نیلی، قوسِ قزحی تتلیوں کے پیچھے بھاگتا رہتا یا بارش کے دنوں میں کاغذ کی ناؤ چلاتا رہتا جب تک کہ ان میں پانی نہ بھر جاتا اور وہ ڈوب نہ جاتیں۔ شاید بے کار گھومتے ہوئے ان لمحات میں میں نے محسوس کیا کہ میں شاعر ہوں۔

میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ کیوں؟ روزگار کی تلاش میں یا کسی دوسرے کے خوف سے؟ لیکن یہ فیصلہ میں نے اس دن کیا تھا جب وہ بڑا لڑکا اپنی کار میں اپنی نئی بیاہی بیوی کو لیے فراٹے سے میرے پاس سے گزر گیا۔ کار کی دھول کے غبار میں میں لپٹ گیا۔ اس کی بیوی سے مجھے عشق نہیں تھا لیکن وہ بچپن میں میرے ساتھ پانی میں ناؤ ضرور چلایا کرتی تھی۔

"کوئی تم شاعری خوب کرتے ہو۔ کیا اس لڑکی کو آزاد نہیں کرا سکتے؟ میرے دل نے شاعر سے پوچھا۔

"کس لڑکی کو؟"

لیکن وہ تو مر چکا تھا۔ اس کی سب بحث ختم ہو چکی تھی۔ شاعر کا فرض کیا ہے؟ اس کا وشواس کیا ہے؟ میرے دل میں شک کے کالے بادل منڈلانے لگے۔

میرا وشواس کیوں ڈول گیا؟ میرا غصہ، میری تشدد کی خواہش اس وقت غائب ہو گئی جب آدھی رات کو جیل میں دو ہاتھ کسی دوسرے کے سرہانے کے نیچے ڈبل روٹی چرا رہے تھے۔

کمرے میں کار کے پہیوں کے گھسٹ کر زور سے رُکنے کی آواز آئی۔ ایک دم بریک لگی اور ایک چیخ فضا میں گونج اُٹھی۔ کار کی روشنی کا آئینہ اندھیرے میں گھوم گیا اور

سفید کپڑوں میں لپٹی لاشیں جگمگا اٹھیں۔ کار ایک دم اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ کمرے کے اندھیرے میں بڑی دیر تک چیخ گونجتی رہی۔ چاروں طرف سے چیخیں گونجنے لگیں۔ دور رات کے اندھیرے میں کوئی سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ پہلے اس سے زنا بالجبر کیا گیا اور پھر اسے ننگا کر کے سردیوں کی ٹھٹھرتی رات کو بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکا دیا گیا اور اس کے سینے میں گولی داغ دی گئی اس کے سر پر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کے برہنہ جسم کا ہر زخم روشن تھا۔

ایسی ہی ایک چیخ میں نے پھر سُنی۔ رات کے اندھیرے میں گاڑی دھیرے دھیرے رینگ رہی ہے۔ ایک دم نعروں کا شور بلند ہوا اور گاڑی رک گئی۔ نیزے، بھالے، بلّم، تلوار لیے لوگ گاڑی میں گھس آئے جسم کٹنے لگے۔ عورتیں، مرد، بچّے لہو میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کسی نے ایک بچّے کو چاند کی گیند کی طرح ہوا میں اُچھالا اور پھر نیچے بھالا رکھ دیا۔ رات کے سنّاٹے میں ایک چیخ گونجی اور پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

صدیاں بیت چکی ہیں لیکن وہ تنہا ابھی تک سولی پر کیوں لٹکا ہوا ہے؟

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ باہر قدموں کی چاپ سُنائی پڑ رہی تھی۔ برآمدے کے پتھروں پر جیک بوٹوں کی کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ۔ شور اور دھواں اور پھر ایک کال کوٹھڑی سے ایک نوجوان کو کھینچ کر نکالا گیا۔ رات کے خاموش اندھیرے میں چوروں کی طرح اسے شہر سے باہر لے جایا گیا اور ندی کے کنارے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پانی میں بہا دیا گیا۔ جیک بوٹوں کی آواز پتھروں پر بڑی دیر تک لوٹتی رہی۔

دن —— دنا —— دن —— گولیاں چل رہی تھیں۔ عورتیں، مرد، بچّے، سب نہتّے۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ چار دیواری کے گھیرے میں شام کی تاریکی میں انھیں گولی سے اڑایا جا رہا ہے۔ سینوں پر گولیوں کے داغ لیے اندھیرے میں لوگ گھوم رہے ہیں اور اندھیرے کے سمندر میں اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔

اور پھر لوگ اور لوگ اور لوگ۔ ہزاروں لوگوں کی بھیڑ شاہراہ پر آگے بڑھ رہی تھی۔ سمندر کے طوفان کی طرح پھیلتی جا رہی ہے: جے جے کار کے نعرے لگاتی، پرچم لہراتی۔ اور ایک آدمی بھیڑ کے سامنے سے چلا آ رہا ہے، ایک پھٹا ہوا پھریرا لیے۔ اُٹھے ہوئے قدموں تلے دھرتی پھسل رہی تھی۔ بار بار بھیڑ کے ریلے سے وہ پیچھے دھکیل دیا جاتا

تھا۔ پھر بھیڑ کے بھنور میں وہ پھنس گیا۔ لوگوں نے شور مچایا: راستے سے ہٹ جاؤ نہیں تو کچلے جاؤ گے۔ لیکن وہ ہیبت زدہ روح کی طرح آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ لوگوں کے پانو تلے روندا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اُٹھ کھڑا ہوتا اور پھر کچل دیا جاتا۔ اس کا چہرہ غصّے اور حقارت سے لال ہو رہا تھا۔

اچانک بھیڑ میں کہیں سے ایک ہاتھ اُٹھا، ایک خنجر بجلی کی طرح چمکا، ایک چیخ کی آواز آئی۔ پرندے ڈر کے مارے درختوں سے اُڑ گئے اور پھر یہ آواز بھیڑ کے فاتح شور میں کھو گئی۔

یہ تیسری لاش کیا اس کی ہے؟ جو کالے، پیلے، نیلے چہروں میں سے اُبھر آئی ہے۔ ایک لاش روندی ہوئی، کچلی ہوئی۔ لہو کا فوارہ اور دیر تک گونجتی ہوئی چیخ۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

جب خنجر بجلی سا چمکتا ہے، گولی دن سے چلتی ہے، کوئی قتل ہوتا ہے یا خودکشی کرتا ہے تو سناٹا کیوں چھا جاتا ہے؟ کیا زخم کی کوئی زبان نہیں ہوتی؟ زخم کے ہونٹ تو ہوتے ہیں، آواز کیوں نہیں؟

"بیس انز رٹن آن دی ڈور اسٹیپ ان لاورا" میں نے ڈائری میں لکھا تھا۔

وہ ہاتھ کہاں ہیں؟ بے رحم، قاتل ہاتھ —— لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لوگوں کا ہجوم آگے بڑھ چکا تھا۔ دشمن انجانا تھا، بے نام تھا، اندھیرے میں کھو چکا تھا اور وہ اپنے دشمن (وہ اسے اپنا دوست سمجھتا تھا جس نے اسے زندگی میں ہر لمحہ دہشت زدہ رہنے کی اذیت سے نجات دلائی تھی) کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

میں نے ان ہاتھوں کو دیکھا ضرور تھا جنھوں نے اس کو قتل کیا تھا لیکن میں انھیں پہچان نہیں سکتا۔ یہ وہی ہاتھ تھے، اس بڑے لڑکے کے، جو ایک معصوم لڑکے کو پیٹ رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو بندوقیں تانے گولیاں چلا رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ندی میں بہا رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اس لڑکی کے کمرے میں بھٹکتے ہوئے پرندے کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اندھیرے میں ایک ساتھی کی ڈبل روٹی چرا رہے تھے۔

لیکن آج میں ان ہاتھوں کو نہیں پہچان سکتا۔ شاید اس لیے کہ میں مر رہا ہوں۔

(کیا میں واقعی مر چکا ہوں؟) صبح کی پہلی کرن کمرے میں چوری چھپے داخل ہوئی۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ اگر ان لاشوں کے بارے میں میں کچھ نہ جانتا تو بات کتنی سادہ ہوتی، محبت کی تثلیث ——— ایک عورت، دو مرد، قتل، خودکشی اور تپ دق۔ لیکن یہ تثلیث نہیں تھی کیوں کہ میں بھی تو مردہ گھر میں موجود تھا ——— چوتھا آدمی۔ قدموں کی ہر آہٹ سے میں چونک جاتا۔ شاید کوئی میری لاش لینے آیا ہے۔

شام تک لوگ آتے رہے اور باری باری سب لاشیں لے گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کلاک نے تین بجائے۔ سناٹا ایک لمحے کے لیے ٹوٹا اور پھر خاموشی۔ اس سنسان، ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات میں کون آئے گا؟ اور وہ بھی ایک مردے کے لیے۔ شاید کوئی لاش لینے آیا ہے۔ میں دروازہ کھولنے کے لیے اٹھتا ہوں اور گر پڑتا ہوں۔ کمرے میں کسی کے رینگنے کی آواز آئی۔ گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنے والے کی شاید آنکھ چمک رہی تھی۔ کیا سانپ کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں؟ اس کی لال زبان شعلے کی طرح اندھیرے میں لپک رہی تھی لیکن مجھے ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا۔ سانپ میرے قریب آ گیا اور پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ صرف سانپ ہی زندہ تھا اور میں اکیلا پڑا تھا۔ میں چھت کو دیکھ رہا تھا جس کی نہ تو کڑیاں تھیں کہ گن سکتا نہ کھلا آسمان کہ تاروں کی چھاؤں ہی ہوتی۔

باہر دو آدمی باتیں کر رہے تھے:

"اس لاش کا کیا بنے گا؟ کوئی نہیں آیا۔"

دوسرا بولا: "لاوارث ہے شاید۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازے پر زنگ لگا تالا لگا تھا۔ وقت کے سیاہ سمندر میں سفید بادبان پھیلا کے میری لاش کا جہاز صدیوں سے چل رہا ہے۔ اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ ساحل۔

مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے دوستو! اس اندھیرے میں میں کب سے بھٹک رہا ہوں۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہ میرے سامنے ایک دم آ کھڑے ہوتے ہیں: بازار میں، گلی میں، موڑ پر، سیڑھیوں پر؛ ہر اس جگہ جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے۔ بجلی کے کھمبے پر برہنہ عورت کی لاش کراس کی طرح اٹھائے وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے: بتاؤ اس کا قاتل کون ہے؟ اور اچانک ... اندر مردانہ قہقہے کی ... لے

گھوڑے پر سوار شیطانی ہنسی ہنستا ہوا وہ آجاتا ہے : بھالے کی نوک پر بچے کی لاش اُچھالتا ہوا۔ وہ دونوں صدیوں سے میرے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ میں کدھر جاؤں ؟ اس گھنے اندھیرے میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اے خدا مجھے روشنی دو۔ لیکن خدا کہاں ہے؟ اس کی لاش بھی تو مُردہ گھر میں پڑی ہے۔

اوم ہنوپروشلم ہیروشمو۔

OO

بلراج مین را

میری انگلیاں دُکھ رہی ہیں کہ ایک مدّت سے میں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔

●

دن ڈھول نکلا ——— خوف زدہ آنکھوں نے دیکھا: شہر کا غرور پانو میں پڑا ہے۔

دیو قامت آئفل ٹاور انجر انجر، پنجر پنجر غائب تھا اور وہ شہر کا شہر عمارت دھواں دھواں تھی جہاں کا کروچ، کیکٹس اور صلیب پناہ گزیں تھے۔

دن ڈھول ہوا ——— شہر کا غرور ٹھوکر غلاظت گاہ کی چوکھٹ پر پڑا ہے۔

کمپوزیشن پانچ

رات آئی ——— رات پہلے جیسی نہ تھی ——— رات جنس زدہ نہ تھی۔

چھبیلوں، بانکوں کے ہاتھوں میں آئفل ٹاور کی پسلیوں اور رگوں کی غلیلیں تھیں اور ان کی جیبیں وزنی پیچ پرزوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان کی تپتی اُبلتی آنکھیں منتظر تھیں ——— جیسے اپنی دھڑکتی رگوں والا وہ ہاتھ اُٹھا، رات کانپنے لگی۔

غلیلیں تن گئیں ——— اور جب غلیلیں ڈھیلی ہوئیں، تپتی اُبلتی آنکھیں شانت تھیں کہ ان گنت کھوپڑیاں چکنا چور تھیں۔

لڑکیوں سے کسی نے کچھ نہ کہا ——— لڑکیوں نے آپو آپ، ہنستے گاتے، گلی گلی، بازار بازار جھاڑ پونچھ ڈالے۔

قطار در قطار بچوں نے شہر کی سرحد سے کھوپڑیوں کو ٹھوکر لگائی اور ہوا میں اچھال دیا۔

اُدھر تھکے ہارے لوگ، تھکے ہارے بے سُدھ پڑے تھے اور وہ جو بے سُدھ نہ تھے، تھکے ہارے نہ تھے، منتظر تھے۔

کھوپڑیاں اونچے مکانوں پر آن پڑیں —— اونچے مکان بھک سے اُڑ گئے۔

تھکے ہارے، بے سدھ لوگوں کے بدن ٹوٹے، تھکن ٹوٹی، انگڑائیاں ٹوٹیں اور آنکھیں کھل گئیں (یہ مشرق تھا)

اور وہ جو بے سدھ نہ تھے، تھکے ہارے نہ تھے، منتظر تھے —— انھوں نے شہروں کو کاٹتی باہمتی درمیانی باڑیں نوچ ڈالیں —— وہ دن، گرم تپتا ہوا دن ——

گرم، تپتے ہوئے ان گنت دن ——

دن گرم ہو یا خنک ہو یا بھیگا ہوا ہو، اک لہر ہے۔

—— اک لہر ہے کہ آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

سمے کے کبھی شانت اور کبھی بپھرے ہوئے سمندر کی اک لہر کے بھلا کیا معنی ہوئے؟

وہ دن،

وہ دن طلوع ہوا —— اک بے معنی دن تھا۔

اُس گرم، تپتے ہوئے دن کی دھول اُڑاتی دوپہر، ٹنڈ منڈ پیڑ کے نیچے میں نے سُنا: لوگوں نے دیکھا ہے، اُس کی برہنہ رانوں پر جونک نما زرد جیلی چپکی پڑی ہے اور اُس نے اپنے کھچڑی بالوں میں پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ اَڑس رکھے ہیں۔

اس ہچکیاں لیتی شام بڈھا سرخ بے وطن یوروپی اس ریسٹوران میں ملا جس کا پچھلا دروازہ رفتگاں کی پگڈنڈی پر کھلتا ہے۔

اُس گہری کالی کرفیو مقید رات دستک ہوئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔

وہ سیڑھیوں پر گرا پڑا تھا۔

ٹارچ کی روشنی کے دایرے میں —— میں نے دیکھا، وہ مرا پڑا ہے۔

لاش کی چوڑی پیشانی پر لکھا ہوا تھا: گوتم نیلمبر

میں کمرے میں لوٹ آیا اور کھڑکی کھول، کرسی کھینچ بیٹھ گیا اور باہر کی اور تکنے لگا۔ زنگ آلود آسمان کو، لاعلاج دم بلب رات کو اور سیڑھیوں پر مردہ پڑے

گوتم نیلمبر کو۔

صبح کی پہلی چاپ سنتے ہی میں نے دیکھا، گوتم نیلمبر کا ٹھنڈا گوشت مٹّی ہونے لگا ہے۔ صبح کی چاپ تیز ہونے لگی اور ٹھنڈا گوشت اور ہڈیاں مٹی ہونے لگیں اور روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ مٹّی مٹّی لاش منتشر ہو گئی۔

میں بے تحاشا ہنسنے لگا۔

——— ماضی پرست ہوں یا ڈریکولا، انت ایک ہی سا ہے۔

اور پھر وہاں کوئی نہ تھا ——— اور یہیں تو چاہتا بھی یہی تھا ——— اور وہ تو چاہتا بھی یہی تھا کہ وہاں کوئی نہ ہو، کہیں کوئی نہ ہو اور جہاں سے وہ آیا تھا، وہاں بھی کوئی نہ تھا لیکن اسے وہاں، بیکار آوارہ گھومتے اتنے دن ہو گئے تھے کہ وہ سنسان اجڑی گلیوں اور خالی بازاروں میں خود اپنے آپ سے ٹکرا جاتا اور گلیوں بازاروں میں زوروں کا دھماکا ہوتا اور اسے محسوس ہوتا، اگر وہ یونہی خود سے ٹکراتا رہا، غفلت کی نیند سویا ہوا شہر کسی دن بیدار ہو جائے گا۔ خود اپنے آپ سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے کی لذّت کا تو وہ منتظر تھا لیکن یہ اسے منظور نہ تھا کہ غفلت کی نیند سویا ہوا شہر بیدار ہو ——— وہ جو غفلت کی نیند سو گئے تھے، کہیں بیدار نہ ہو جائیں، اس نے وہ شہر چھوڑ دیا اور پہاڑی پہاڑی اس خوف کے ساتھ، کہیں اُس جیسا کوئی دوسرا وہاں نہ ہو، وہاں پہنچا۔

خوف تو اپنے جیسے کسی دوسرے سے ہونا ہے (وہاں کوئی نہ تھا) اور وہ جگہ جہاں اپنے جیسے کسی دوسرے سے ملنے کے امکانات نہ ہوں، کہاں تھی، یہ اسے معلوم نہ تھا۔

پہاڑیوں کا وہ سلسلہ اُس کے قدموں تلے ختم ہوا پڑا تھا ——— نیچے سمندر تھا اور اس کے دائیں ہاتھ پہاڑی کا دامن نم کیے دھیمے دھیمے بہتا دریا سکون کے ساتھ وشال سمندر میں پناہ لے رہا تھا اور بائیں ہاتھ پہاڑی کی ڈھلان پر سیڑھی سیڑھی دراز سبز گھنا جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا ——— آسمان نیلا تھا اور پگڈنڈی کے بل واضح تھے۔

پگڈنڈی کے واضح بل بے معنی تھے کہ اسے لوٹنا نہیں تھا۔ آسمان کی نیلی رنگت بھلی لگتی، بس بھلی تھی کہ اُس کا رشتہ تو زمین سے تھا، اُس نے مزید غور نہ کیا اور دریا تو

خود سمندر کی پناہ لے رہا تھا اور جنگل بھی سمندر کنارے تک بڑھ پایا تھا اور پہاڑی بھی بڑھتے بڑھتے یوں اچانک رک گئی تھی جیسے ڈوب جانے کے خوف نے پاؤں پکڑ لیے ہوں ـــــ

اور سمندر ؟

بہت دن تک وہ وقت کی رفتار سے باخبر رہا لیکن ایک دن آسمان کی بھلی بھلی سی نیلی نیلی رنگت اور سمندر کی برق سی چمک نے وہ جال بچھایا کہ وہ محویت کے عالم میں وقت سے پیچھے رہ گیا اور جب وقت کی رفتار پہاڑی کے اس آخری نقطے پر اُس کی پہچان کی حدود میں نہ رہی، وہ خود اپنے آپ سے ٹکرا گیا۔

پگڈنڈی، پہاڑی، جنگل، دریا، آسمان، سمندر، کوئی بھی تو غفلت کی نیند نہ سویا ہوا تھا ـــــ وہ پہاڑی سے نیچے کود گیا۔

نہ جانے کتنے سورج سمندر ہی سے نکلے، اور نہ جانے کتنے سورج سمندر ہی میں ڈوبے اور نہ جانے کتنے سورج اس کی آنکھوں میں اترے ـــــ وہ ہاتھ پاؤں مارتا لہر لہر سے ٹکراتا رہا۔

دور ساحل تھا۔

ساحلِ سمندر صحرا کا کنارا تھا ـــــ سامنے صحرا پھیلا پڑا تھا اور وہاں کوئی نہ تھا۔

ـــــ سورج دو ہیں، ایک سر پہ ہے اور ایک ریزہ ریزہ صحرا میں پھیلا پڑا ہے۔

اور یوں کہ پاؤں تلے ریت، سر میں ریت، آنکھوں میں ریت، مُنہ میں ریت ـــــ اُس نے نخلستان میں چشمے کے ٹھنڈے اجلے پانی سے تن صاف کیا اور قدم بڑھائے۔

اب واحد غائب واحد حاضر کی صورت میرے سامنے کھڑا ہے۔

ہم ریلنگ کا سہارا لیے کھڑے ہیں ـــــ دو گھنٹے ہوئے، ہم اتفاقاً ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے، ہمارے قدم رُکے تھے اور پھر ہم بغل گیر ہوئے تھے ـــــ

میں آٹھواں سگریٹ پی رہا ہوں اور دو گھنٹوں سے خاموش ہوں کہ وہ دو گھنٹوں سے خاموش ہے۔ میں اس سے بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا ہوں اور یہ نہیں جانتا، وہ مجھ سے بہت ساری باتیں کہنا چاہتا ہے یا نہیں۔

وہ ایک نظر مجھے دیکھتا ہے، مسکراتا ہے اور میں جان لیتا ہوں، وہ کہہ رہا ہے:
آؤ یار مرے! کافی پئیں ——— کالی کافی، گرم اور کسیلی ———

ہم وہیں بیٹھے ہیں، جہاں ہم نے زندگی کے دس برس جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اہم برس تھے یا غیر اہم برس، گزارے ہیں، کافی پی رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ میں اس کی موجودگی میں نواں سگریٹ پی رہا ہوں۔ ایک سگریٹ اور ہے اور میں چند لمحوں میں اسے بھی دھواں اڑا دوں گا اور پھر اور سگریٹ لینے باہر جاؤں گا اور لوٹنے پر اسے نہ پاؤں گا، ہاں! پیالی تلے ایک پرزہ رکھا ہوگا ——— "پھر کبھی ———" ہم ہمیشہ ایسے ہی ملتے ہیں، خاموش رہتے ہیں۔ میں سگریٹ پیتا رہتا ہوں اور یہ جانے بنا ہی کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے یا نہیں، اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور پھر ہمیشہ سگریٹ لینے باہر جاتا ہوں، اور لوٹنے پر مجھے ہمیشہ پیالی تلے پرزہ رکھا ہوا ملتا ہے، "پھر کبھی ———"

پھر کبھی ——— لیکن کب، کہاں ؟!

آنے والے کل کا شہر، جہاں آج گھنی گہری نیلی آنسو گیس پھیلتی رہتی ہے جہاں آنکھوں سے لہو بہتا ہے۔

ان گنت قابلِ فہم اور مانوس آوازوں کا شہر، جہاں "ہمارا نام، تمھارا نام ——— ویت نام، ویت نام"، بیک آواز، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک، صبح و شام، آٹھوں پہر جستجو، جدّ و جہد اور جنگ کا لازوال ہتھیار ہے۔

آنے والے کل کے سرخ شہر کی گلیاں، بازار، چوک، پارک اور کافی ہاؤس روندتا ہوا بڈھا یورپی جو شمشان گھاٹ، گرجا گھر اور کنچن جینگا کے معنی جانتا ہے۔

وہ کون ہے؟ وہ ایک سرخ شہری ہے۔

میں کون ہوں؟ میں وہ ہوں۔

اور وہ (میری) کرسی ؟!

لمبی، بہت لمبی ٹانگیں۔ لمبے، بہت لمبے بازو۔ اونچی، بہت اونچی پشت ——— مغرب کی جانب رخ کیے ہوئے وہ کرسی۔

کرسی کے لمبے، بہت لمبے بازوؤں پر پڑے ہوئے لمبے بازو؛ گری ہوئی ہتھیلیاں

اور گری ہوئی انگلیاں - کرسی کی اونچی، بہت اونچی پشت سے جڑی ہوئی اونچی پشت اور اونچی، تنی ہوئی گردن - زمین کی جانب سیدھی لٹکی ہوئی لمبی ٹانگیں - ننگے پانو - ذہن خالی - دل کی دھڑکن خاموش، نبض کی رفتار تھمی ہوئی، مساموں کا کام کاج بند — وہ ساکت بے جان جسم اور وہ آنکھیں — زندہ آنکھیں، روشن آنکھیں — بڑی بڑی آنکھیں — متحرک پتلیاں اور زندہ آنکھیں — بے جان جسم اور زندہ آنکھیں، زندہ آنکھیں اور بے جان جسم — کون کس کی زندگی اور کون کس کی موت ؟

مغرب کی جانب رُخ کیے ہوئے کرسی میں مقیّد ساکت اور بے جان جسم،

ساکت اور بے جان جسم میں مقیّد زندہ اور روشن آنکھیں،

آنکھوں کے سامنے — آنکھوں کے سامنے آئینہ (کتاب ؟!)

آئینہ ؟!

شمال کی جانب شمال کی آخری حد تک آئینے کی دیوار !

جنوب کی جانب جنوب کی آخری حد تک آئینے کی دیوار ؟!

آسمان کی جانب آسمان کی انجانی بلندیوں تک آئینے کی دیوار !!!

آنکھوں کے سامنے آئینہ،

آئینہ، اجلا، صاف، شفّاف —

— میں نے سگریٹ سلگایا۔

وہ سُرخ شہری ہے اور میں وہ ہوں - کہیں گھپلا ہے ؟ میں وہ ہوں اور وہ سُرخ شہری ہے - میں سُرخ شہری کیوں نہیں ؟ میں — میں سُرخ شہری ہوں — نہیں، نہیں، میں سُرخ شہری نہیں ہوں - یہ تو میری تحریر کے "میں" کی پرابلم ہے — میں اور میری تحریر — میں اور میری تحریر کا "میں" —"

— اک جنگِ ناتمام —

●

میری انگلیوں کے دکھ میں کمی آگئی ہے۔

سریندر پرکاش

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں"
اور انھیں کلائیوں تک برف میں گاڑ دیتے ہیں"
انگلیاں ٹھنڈ سے دھیرے دھیرے وا ہو جاتی ہیں،
اور پھر بانہیں، اپنی جڑیں برف میں پھیلا دیتی ہیں،
زندگی کا رس ناڑیوں کے رستے سارے ہاتھ میں گردش کرنے لگتا ہے،
اور جب ٹھنڈی زندگی جوش مارتی ہے۔
تو انگلیوں کی پوروں میں سے خون کا ایک قطرہ اچھل کر باہر آ ٹپکتا ہے،
اور ہر طرف سرخ سرخ پھول کھل اٹھتے ہیں"

برف پر مکالمہ

سفید بھربھری برف یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور سب طرف جا بجا کٹی ہوئی بانہیں گڑی ہوئی تھیں نیچے وادی میں گاؤں کے مکان دکھائی دیتے تھے جن کی چھتوں پر برف کی پرت جمی ہوئی تھی۔ اوپر پہاڑ کی بلندی پر ریلوے اسٹیشن تھا جس کے سگنل کا کھمبا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی، ابھی گاڑی پلیٹ فارم سے چھوٹی تھی، جو حسب معمول لیٹ تھی معلوم نہیں یہ لائن کب بچھی تھی، پہاڑ کب کٹا تھا اور کب پہلے دن گاڑی لیٹ آئی تھی۔ اب گاڑی آگے گئی تھی۔ آگے کچھ اور اسٹیشن ہیں۔ ان اسٹیشنوں کے گرد کچھ اور گاؤں ہیں اور ان گاؤں کے راستوں پر اسی طرح کٹے ہوئے بازو برف میں گڑے ہوئے ہیں۔

اس نے وہ اگلے گاؤں کبھی نہیں دیکھے اپنے گاؤں بھی وہ بڑی مدت بعد آیا تھا ——
وہ جب یہاں سے گیا تب یہاں سب طرف سمندر تھا اور وہ سب مچھلیاں تھے کہ سمندر کی بیکرانی

میں تیرتے پھرتے تھے . . .

. . . ایک دن کی بات ہے۔ اس نے سمندر کے بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ مچھلی کو دیکھا جو بھگوے لباس میں ملبوس تھا اس نے بڑھ کر اس کے ننھے، ننھے خوشنما سنہری پروں کو بوسہ دیا اور تعظیم سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر اَن جانے میں اس کے منہ سے سوال نکلا :

"یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟ اور ہمارے بازار میں یہ رونق کس کے دم سے ہے؟"

. . . سفید ریش بزرگ مچھلی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانہ سی چمک پیدا ہوئی اور مسکراہٹ سے اس کا چہرہ پھیل گیا۔ سفید سفید دانت برف کی طرح چمکنے لگے ——— پھر اس نے دیکھا کہ سمندر کی سطح پر ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی ہیں اور سمندر کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں اور ہواؤں میں خنکی شدید ہوتی جا رہی ہے اور پانی لحہ لحہ جم کر برف میں تبدیل ہونے لگا ہے اور سفید ریش بزرگ کے ننھے ننھے سنہری پنکھ جھڑ کر گر گئے ہیں اور سب مچھلیاں دُم دبا کر اور پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کا بازار ویران ہو گیا ہے۔

یہ بہت مدّت کی بات ہے۔ تب ہی اس نے یہاں سے ہجرت کی تھی۔

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں،

اور انھیں کلائیوں تک برف میں گاڑ دیتے ہیں۔"

برف! . . . برف کے گالے دھیرے، دھیرے آسمان سے ٹپک رہے تھے اور دُور نیچے اس کا گاؤں برف اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

چند روز پہلے اس نے اپنا گاؤں خواب میں دیکھا تھا ——— ایسے ہی برف اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے بچے نے گاؤں کی گلی میں برف اکٹھی کر کے ایک مجسمہ بنایا تھا اور اس کی طرف اشارہ کر کے اپنی ماں سے کہا تھا ——— "دیکھو ماں! یہ میرا باپ ہے، جو برف جمنے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔"

خواب کے گلیاروں میں سے گزرتے ہوئے اس نے جب بیداری کی دہلیز پہ قدم رکھا تو اسے اپنا بچہ، اپنی بیوی، اپنے ماں باپ، دُور کے سمبندھی اور اپنا گاؤں خوب جی بھر کر یاد آئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تب وہ سو دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ

ہوا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تو گاڑی اسے پہاڑوں پر جمی برف کی طرف لے کر بھاگی اور حسبِ معمول اس کے گانو کے قریبی اسٹیشن پر پہنچی۔

وہ پلیٹ فارم پر اترا اور پھر باہر نکل کر برف پر پھسلتا ہوا اپنے گانو جا پہنچا۔

اس کے بچوں اور بیوی نے اور ماں باپ نے اور سمبندھیوں نے اپنی باہیں وا کر دیں تاکہ اسے اپنے سینوں کے ساتھ بھینچ سکیں۔ تب یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سب کے بازو کہنیوں سے کٹے ہوئے ہیں۔

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں۔"

وہ سہم کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے محبّت کی گرمی سے تمتما رہے تھے اور آنکھیں آب دیدہ ہو گئی تھیں۔

اس روز ہر گھر میں خوب پکوان پکے اور پھر سب گھروں میں اس کا تبادلہ ہوا۔ اور لوگوں نے خوب دانتوں سے کاٹ، کاٹ کر ان کو کھایا۔

وہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا ہوا سارا عرصہ مسواک سے اپنے دانت رگڑ رگڑ کر صاف کرتا رہا۔ پھر سب بچے جب خوب پیٹ بھر کھا چکے تو اس کی آغوش میں آ کر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے وہیں سو گئے۔

جب گانو والوں نے بچوں کو اس کی گود میں سے اٹھایا تو اسے اپنی ویران سی گود بڑی عجیب لگی۔

ایک سفید ریش بزرگ مسکراتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھگوے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب دیوانہ سی چمک تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے۔ "برف کیوں کر جم گئی؟ کہنیوں تک کٹے ہوئے بازو کلائیوں تک اس میں کیوں گاڑے گئے اور انگلیوں کی پوروں سے سرخ پھول کیوں کر پھوٹ پڑے؟"

مگر وہ یہ سب نہ پوچھ سکا کیوں کہ سفید ریش بزرگ کا پُرجلال چہرہ اس کے بہت قریب آ گیا اور اس نے اپنے خوب صورت سرخ ہونٹ اس کے کان کے قریب لے جا کر سرگوشی میں کہا ــــــ "سب رسمیں ختم ہو گئیں، اب تم سو جاؤ!"

اس نے محسوس کیا کہ اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔ اس کے بوڑھے ماں باپ نے اس کے سر پر شفقت سے اپنے ٹنڈ پھرائے پھر سب طرف اندھیرا چھا گیا۔ اس

اندھیرے میں اس کی بیوی کا ننگا جسم کندن کی طرح دمکنے لگا اور خواب کے گلیاروں میں مسافر بھٹک گیا۔ جب اس کی بیوی انتہائی مطمئن ہوئی تو اس نے اپنے چمکیلے سفید دانتوں سے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو کاٹ لیا۔ وہ کراہ کر ایک طرف لڑھک گیا اور ساری رات اس کی انگلیاں اس کی بیوی کے دانتوں میں دبی رہیں۔

"جب ٹھنڈی زندگی جوش مارتی ہے تو انگلیوں کی پوروں سے خون کا ایک قطرہ اچھل کر باہر آ ٹپکتا ہے"!

رات گزر گئی تو برفیلی سفید صبح سب طرف پھیل گئی۔ وہ گھر سے نکلا اور گانو کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ وہاں اس نے برف اکٹھی کر کے ایک چھوٹی سی ڈھیری بنائی اور اس پر اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے لکھا —— "ایک رات گزر گئی!"

جب وہ پلٹا تو اس نے دیکھا۔ گانو کے سبھی لوگ اس کی پشت پر کھڑے اس کی یہ حرکت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کے استفسار تھے اور چہروں پر جذبے سمندر کی لہروں کی طرح اُمڈے پڑ رہے تھے —— اس کا خیال تھا کہ اب کوئی ہنگامہ کھڑا ہوگا۔ مگر کچھ نہ ہوا، سوائے اس کے لوگوں کی زبانوں پر اُس دن کے کھائے ہوئے پکوانوں کا جو ذائقہ تھا، ختم ہو گیا۔ اس کا باپ کمر کے ساتھ تلوار لٹکائے دن بھر پھرتا رہا اور جب اگلی رات آئی اور اس کی بیوی نے اپنا لباس اتار دیا، تو اس کا باپ کمرے میں فرش پر جمی برف میں سے ابھرے ہوئے قدیمی پتھر پر اس تلوار کی دھار تیز کرنے لگا۔ اور اس کی ماں پاس بیٹھی چکی چلاتی رہی اور گھر کا چراغ پھڑ پھڑاتا ہوا جلتا رہا —— وہ ساری رات سو نہ سکا۔

اگلے دن صبح وہ پھر وہیں گیا، اس نے برف کی ایک اور ڈھیری بنائی اور اس پر اپنی انگلی سے لکھا۔ "ایک رات اور گزر گئی۔!"

اس کے باپ کی تلوار ہر رات پتھر پر گھستی رہی۔ حتیٰ کہ گھستے گھستے وہ لوہے کی ایک تار کی طرح باریک ہو گئی۔ اور پھر گانو والوں نے اس کے باپ کو پکڑ کر گانو کے چوک میں کھڑا کیا۔ اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور اس کی ماں کو کہا کہ وہ ان ٹکڑوں کو اپنی چکی میں پیس ڈالے — اور اس کی ماں نے بین کرتے ہوئے اُن ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے چکی میں پیس ڈالا، پھر سب نے آٹے کی ایک ایک چٹکی اپنی جھولی میں ڈالی اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ اس کی ماں رات گئے تک چوراہے پر بیٹھی چکی چلاتی اور بین کرتی رہی۔

اگلے دن صبح اس نے پھر وہیں جا کر برف کی ایک ڈھیری بنائی۔ اور اس پر اپنی انگلی سے لکھا۔ "ایک رات اور گزر گئی۔!"

جب چکّی میں پسا ہوا تمام آٹا ختم ہو گیا تو یہ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اس کے بچّوں کے پیٹ پیٹھ سے جا لگے اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر اس کی بیوی سب گھروں میں گئی ——— مگر بے نیل و مرام لوٹی اور گھر میں آتے ہی اس پر برس پڑی:

"تم ایسا کیوں کرتے ہو آخر؟ تم کیوں ان کا کہنا نہیں مان لیتے؟ تم کیوں اپنے بازو نہیں کٹوا ڈالتے۔؟ ——— باپ مر گیا ——— ماں کی چکّی کا سارا آٹا ختم ہو گیا! پھر بچّے بھوک سے بلک بلک کر مر جائیں گے ——— تم پھر وہیں جاؤ گے اور ایک ڈھیری اور بناؤ گے اور اس پر لکھو گے "ایک رات اور گزر گئی۔!"

وہ شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ اس کی آواز کی گونج سے کئی گلیشیر ان کے گھر کی طرف لڑھکے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۔ ۔ ۔

"بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں۔"

وہ اپنے ذہن میں بار بار گونجنے والی اس آواز اور اپنے سامنے والے اس منظر کی تاب نہ لا سکا ۔ ۔ ۔ اور رات کے اندھیرے میں گھر سے دیوانہ وار بھاگ نکلا۔ جب وہ گانو سے دُور اس جگہ پر پہنچا جہاں اس نے وہ ڈھیریاں بنا رکھی تھیں تو اس نے انھیں گِنا ——— وہ تعداد میں پچپن تھیں۔

اس نے پلٹ کر دیکھا سارا گانو برف اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے تباہ شدہ مکان کے باہر گلی میں برف کا وہ مجسّمہ ابھی تک جوں کا توں کھڑا تھا۔ جیسے کبھی اس کے بچّے نے بنایا تھا اور جو اُس کے کہنے کے مطابق اُس کے باپ کا تھا جو برف جمنے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

اس کی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو ٹپکے اور پھر سرد برفیلی ہوائیں زوروں سے چلنے لگیں اور دونوں آنسو اس کے رخساروں پر ہی جم گئے۔

برف اور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے گانو کے ہر مکان کا دروازہ کھلا اور اُس نے برف کی چمک کی مدھم روشنی میں دیکھا۔ ہر دروازے سے لوگ اپنی بانہوں کے ٹنڈ کے ساتھ تلوار باندھے ہوئے اس کی کھوج میں نکل پڑے ہیں۔

"انگلیاں ٹھنڈ سے دھیرے، دھیرے وا ہو جاتی ہیں اور پھر باہیں اپنی بڑیں برف میں پھیلا دیتی ہیں۔"

وہ بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ دور سامنے پہاڑ کی بلندی پر ریلوے اسٹیشن کے سگنل کی سرخ بتی جل رہی تھی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے گاڑی حسب معمول اس کے پلیٹ فارم پر لیٹ آئی تھی اور اگلے گاؤں کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ وہ جانتا تھا جب وہ گاڑی لوٹ کر آئے گی تو اسے واپس لے جائے گی۔

برف کے گالے آہستہ آہستہ گر رہے تھے اندھیرا اس قدر دور ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے زمین پر آرہا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی، پھر وہ چیز جس سے وہ ٹکرایا تھا حرکت میں آئی اور اس نے ایک آواز سنی۔

"اندھیرا بہت ہے مگر آہستہ چلو۔ یوں ٹکراتے پھرنے کے کیا معنی؟"

اسے پتہ چلا کہ وہ بھی کوئی آدمی تھا، کوئی دوسرا آدمی جو اس کی مخالف سمت سے آرہا تھا۔ اس نے معذرت طلب لہجہ میں کہا۔ "معاف کرنا بھائی۔ میں بہت خوفزدہ تھا۔ اس لیے . . ."

"اوہ! تو تم ہو!" سامنے سے دوسرے آدمی کی آواز آئی۔ "میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ تمھارا گھر اور میرا گھر ساتھ، ساتھ ہیں۔ میری بیوی اور تمھاری بیوی سہیلیاں ہیں۔ میرے بچے اور تمھارے بچے ساتھ ساتھ کھیلتے ہیں، تمھاری ماں کے پاس میری ماں کی چکی ہے۔ کہو کب آئے؟"

آنکھیں اب اندھیرے سے قدرے مانوس ہو چکی تھیں۔ اس نے دیکھا اس کے سامنے جو آدمی کھڑا تھا صحیح وہ اسے تھوڑا تھوڑا پہچانتا تھا۔

اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا:

"میں نے خواب میں اپنے گاؤں کو برف اور اندھیرے میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا تو میں بے چین ہو اٹھا۔ میں نے بڑی منت سماجت کر کے سو دن کی چھٹی لی۔ جب میں وہاں سے بھاگا ہوں تو وہاں پچپن ڈھیریاں تھیں۔ ہر صبح میں برف اکٹھی کر کے ایک ڈھیری لگا دیتا تھا۔ ابھی میرے پاس پینتالیس دن کی چھٹی باقی ہے۔ مگر میں لوٹ رہا ہوں!"

"لیکن سنو!" دوسرے آدمی نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔ جب تم واپس جاؤ گے اور اتنے دن پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤ گے تو اُن کو کیسے مُنہ دکھاؤ گے وہ پوچھیں گے گھر سے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے۔ تو کیا جواب دو گے؟"

وہ کافی دیر تک خاموش رہا اور سوچتا رہا ——— کہ اُن کو کیا جواب دے گا!
اُس نے دیکھا دائیں طرف ایک بڑی سی چٹان کھڑی تھی جس کی جڑ میں ایک گہرا غار تھا اور اُس غار میں بے انتہا اندھیرا تھا۔

اندھیرے میں وہ سوچ رہا تھا۔ "وہ کیا جواب دے گا؟ وہاں جا کر وہ کیا جواب دیگا؟
پھر وہ یک بیک چیخا:

"اگر میں بازو کٹوا کر اور پورے دن گزار کر وہاں جاؤں گا تو وہ مجھے اپاہج سمجھ کر ایک طرف بٹھا دیں گے اور جب بھی میرے پاس سے گزریں گے نفرت سے میری طرف دیکھ کر مُنہ پھیر لیں گے۔ کیا وہ شرمندگی اس شرمندگی سے کم ہوگی کہ میں جا کر صاف، صاف کہہ دوں کہ میں جلد لوٹ آیا ہوں مگر میں نے بازو نہیں کٹوائے!"

"بازو؟ کیسے بازو؟ ——— کون کاٹتا ہے بازو؟" دوسرے آدمی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس نے اپنے لہجہ پر قابو پاتے ہوئے اور گلے کو تھوک سے تر کرتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"وہ بازو کہنیوں سے کاٹ لیتے ہیں اور انھیں کلائیوں تک برف میں گاڑ دیتے ہیں۔ انگلیاں ٹھنڈ سے دھیرے دھیرے وا ہو جاتی ہیں اور پھر بانہیں اپنی جڑیں برف میں پھیلا دیتی ہیں۔ زندگی کا رس ناڑیوں کے رستے سارے ہاتھ میں گردش کرنے لگتا ہے اور جب ٹھنڈی زندگی جوش مارتی ہے تو انگلیوں کی پوروں میں سے خون کا ایک قطرہ اچھل کر باہر آ ٹپکتا ہے اور ہر طرف سرخ، سرخ پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ تب وہ کہتے ہیں۔ "وادی میں بہار آ گئی!"

"تم... تم نے میرے لیے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ تو... تو کیا میں وہاں اپنے بازو کٹوانے جا رہا ہوں۔؟" دوسرا آدمی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"وہ دیکھو! دور اندھیرے میں جو سایے نظر آرہے ہیں نا! وہ گاؤں کے لوگ ہیں جو تلواریں سونتے میری تلاش میں برف پر دوڑے آرہے ہیں، ہیں ان کے یہاں آنے سے پہلے

اسٹیشن تک پہنچ جانا چاہتا ہوں تاکہ جب گاڑی اگلے گاؤں سے واپس آئے تو میں اس میں بیٹھ کر بھاگ لوں۔ وہاں جیسی بھی شرمندگی ہوگی سہہ لوں گا!" اس نے جواب دیا۔

"تم... تم بڑے عجیب آدمی ہو! دوسرے آدمی کی کانپتی ہوئی آواز میں قدرے درشتی تھی "تم نے اپنے لیے اور میرے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ تم نے سوچ لیا ہے کہ شرمندگی تمھارا مقدر ہے اور اسے تمھیں سہنا ہے۔ یہ بات بازو کٹوانے سے بھی زیادہ ذلت آمیز ہے۔ جسمانی طور پر اپاہج ہونا یا ذہنی اعتبار سے پست ہونا دونوں میں مجھے کوئی بنیادی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ مگر... مگر میں کیا کروں ——؟ —— جب تم گاؤں میں گئے ہوگے تو سب طرف امن تھا۔ مگر اب ہر ہاتھ میں تلوار ہے —— اور میں اپنے لوگوں میں ایک لمحہ بھی گزار نہیں پایا!"

دوسرے آدمی کی آواز دھیرے، دھیرے مدھم ہوتی ہوئی بالکل ڈوب گئی۔

اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ وہ سردی سے اور خیالات کی تیز رفتاری کی وجہ سے جھولنے سا لگا —— اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ نیچے وادی میں لوگوں کے بھاگنے کی آہٹیں ہر لمحہ قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے سوال بنے کھڑے تھے۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی اور اس اندھیرے اور خاموشی میں برف کے گالے ایک، ایک کر کے گر رہے تھے۔

اچانک سامنے والی چٹان کے ساتھ کسی زخمی پرندے کی دلدوز چیخ ٹکرائی۔ وہ دونوں یک بارگی ادھر متوجہ ہوئے، پھر انھیں زخمی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، تب چٹان کے نیچے والے غار میں سے ایک سایہ نکل کر ان کی طرف لپکا اور انھوں نے دیکھا وہ ایک تیسرا ہی آدمی تھا۔

وہ ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے زور کا ایک قہقہہ لگایا —— انھیں زخمی پرندے کی دل دوز چیخ پھر سنائی دی۔ وہ دونوں ومم بخود سے اسے گھورنے لگے۔ تب اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہنا شروع کیا:

"میں نے آپ لوگوں کی سب باتیں سن لی ہیں۔ تم دونوں کے پاس صرف لمحوں اور دنوں کا حساب ہے۔ مگر ادھر دیکھو۔!"

ان دونوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا لبادہ اُتار پھینکا تھا۔

اور انھوں نے دیکھا کہ اس کے دونوں بازو کندھوں سے کٹے ہوئے تھے۔

کچھ دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر وہ بولا:

"کئی صدیاں بیت گئیں۔ تب یہاں برف نہ تھی، سمندر تھا۔ اور ہم سب اس کی بے کرانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ ایک دن کی بات ہے میں اپنے بھگوے لباس میں سمندر کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک نوجوان مچھلی نے مجھے روکا۔ اور میرے سنہری بازوؤں کو بوسہ دیا۔ اور مجھ سے بڑی تعظیم سے پوچھا:

"یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟"

میں سوچ میں ڈوب گیا اور میرے سنہری بازو جھڑ کر گر گئے۔ پھر سمندر کا پانی برف میں تبدیل ہونے لگا اور سارا بازار ویران ہو گیا۔ میں تب سے اس کھوہ میں بیٹھا برف پگھلنے کا انتظار کر رہا ہوں ——— کب برف پگھلے گی اور کب میرے بازو مجھے ملیں گے؟ لیکن یقین جانو ایک دن ایسا ہو گا ضرور! اور ہم سب پھر مچھلیوں کی طرح اس سمندر کی بے کرانی میں تیرتے پھریں گے ——— تب تک سب کے بازو کٹ چکے ہوں گے ——— کہ مچھلیوں کے بازو نہیں ہوتے!"

تینوں آدمی برف پر کھڑے ایک دوسرے کی طرف بٹر بٹر دیکھ رہے تھے۔ دور سے گاؤں والوں کی تلواروں کی چمک ستاروں کی مدھم روشنی میں دکھائی دینے لگی تھی۔ اور ریلوے اسٹیشن کا برفیلا پلیٹ فارم ابھی ویران تھا کہ گاڑی اگلے اسٹیشن سے ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

○○

جوگندرپال

میرا آفس دنیا کے اس سب سے بارونق شہر میں ایک چالیس منزلہ جدید عمارت، فائر آرم، کی چالیسویں منزل پر واقع ہے، فائر آرم، کو نئے انسان نے اپنی تمام تر سائنسی تدبیر کو کام میں لا کر تعمیر کیا ہے اور اس کی ٹاپ پر میری شاپ ہے جہاں وہ مجھ سے اپنی قسمت دریافت کرنے آتا ہے۔

میرا پیشہ جیوتش ہے اور پسند فلسفہ۔

جیوتش میرے لیے کوئی ہتھکنڈہ نہیں، ایک باقاعدہ روحانی سائنس ہے (سائنس جھوٹ نہیں بولتی اور روحانیت جھوٹ کی سچائی کو بھی تسلیم کرتی ہے)، میں نہایت احتیاط سے اندھیرے میں رک رک کر بڑھتا چلا جاتا ہوں اور ان اجنبی تاریکیوں میں مجھے کہیں کہیں روشنی کے نقطے نظر

رسائی

آنے لگتے ہیں اور ان نقطوں کی دھندلی سی ٹمٹماہٹ میں انجانے کی جانی پہچانی علامتوں کا احساس ہوتا ہے اور ان علامتوں کو اپنے ذہن میں منقش کر کے ——— میرے ذہن میں کائنات کی ان گنت علامتیں جمع ہو چکی ہیں اور ان سب علامتوں کی کیٹالاگنگ میں نے اتنی خوبی سے کر رکھی ہے کہ بیشتر مسائل کے حل مجھے بغیر کسی وقت کے یہیں مل جاتے ہیں ——— میں اپنے جسم میں لوٹ آتا ہوں، یہاں اپنے انٹرویو روم کے عقب میں اس آرام کرسی پر اور میرے جسم میں حرکت ہونے لگتی ہے۔ اپنی روز افزوں شہرت سے اب مجھے اکثر یہ خوف رہتا ہے کہ اگر میری غیر موجودگی میں کوئی میرے جسم کو لے اڑا تو ——— تو میں اور میرا ذہن کہاں رہیں گے، میرا ذہن سدا میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے ——— ساتھ ساتھ؟ کہاں؟ ——— میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ جسے میں اپنا آپ کہتا ہوں، وہ کیا ہے؟ میرا ذہن یا میں؟ ——— یا میرا ذہن ہی میرا اپنا آپ ہے؟ ، ——— ؟ اپنے جسم کے بغیر میں کہاں رہوں گا؟ فائر آرم کی

چالیسویں منزل میں ؟ میرے اس مسکن کے بارے میں پہلے ہی مشہور ہے کہ یہاں بھوت پریت بستے ہیں (بھوت پریت بے چارے کہیں وہ مظلوم لوگ تو نہیں جن کے جسم اُن سے چھڑائے جا چکے ہوں۔)

ایک بار میں اپنی کسی پیشہ ورانہ کھوج کے بعد جسم کی جانب لوٹ رہا تھا کہ "فائرارم" کی چالیسویں منزل پر پہنچ کر بے خیالی میں انٹرویو روم میں یوں ہی اپنی چیئر پر آ بیٹھا اور روزمرہ کا کام شروع کر دیا۔ حالانکہ میرا جسم عقب کے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ میری پہلی ملاقاتی ایک حواس باختہ شادی شدہ خاتون تھی، مسز بارکر، جو اپنے شوہر کی پیہم بدسلوکی کی وجہ سے اپنے مستقبل سے ڈرنے لگی تھی۔ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بڑے تپاک سے مسکرا کر اُس سے خوش آمدید کہا اور مجھے خیال نہ آیا کہ میں یہاں بے جسم ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ نہ معلوم میں اس خاتون کو نظر کیسے آ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھنے لگی۔

"آپ اندر جا کر بیٹھیے"۔ میں نے عقب کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا مگر اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں اچانک اچھل پڑا اور اس سے پہلے کہ کچھ کر پاؤں، مسز بارکر تیز تیز اُلٹے پاؤں باہر آ گئی۔

"کم اِن، مسز بارکر!"

عقب کے کمرے سے میری آواز نے اُس کا باہر لفٹ تک تعاقب کیا۔

میرا خیال ہے اکثر ایسا ہوتا ہو گا کہ ہماری ملاقاتیں انسانوں کی بجائے دراصل ان کے بھوتوں سے ہوئی ہوں اور اپنی لاعلمی میں اُن سے مل کر ہم بہت خوش ہوئے ہوں، مگر پھر اُن ہی لوگوں سے اُن کی صحیح و سالم حالت میں مل کر ہمیں اُن پر بھوت ہونے کا گمان گزرا ہے اور خوفزدہ ہو کر ہم جسم کے اندر ہی اندر گھس کر جسم کے باہر نکل آئے ہوں۔

کئی بار مجھے اپنے بھوت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ میں اپنے وجود کے اندر آرام کر رہا ہوتا ہوں جیسے کسی قبر کے اوپر اُگے ہوئے ببول کی جڑیں الٹی لٹکتی ہوئی کوئی خوابیدہ رُوح کبھی اوروں کے وجود میں، اور کبھی نہ اپنے اندر نہ اوروں کے، نہ معلوم کہاں ہوتا ہوں۔ یا شاید کہیں بھی نہیں ہوتا۔ کہیں نہ ہو کر بھی ہونا شاید اسی کا نام موت ہے۔ میرے مسلسل ریاض نے مجھے جیتے جی ہی مرنے کا اہل بنا دیا ہے۔ میں ایک ہی زندگی میں بیک وقت جی بھی رہا ہوں اور مر بھی رہا ہوں۔ کیا یہی ابدیت ہے ؟ میری ذات میری نوع کی مانند غیر فانی ہو چکی ہے ؟ مجھے

اپنی ابدیت کا علم ہے یا میرا علم لاعلم ہے؟ ——— مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کیا جانتا ہوں۔
میں لاعلم ہوں۔ کسی کامیاب دنیادار کی طرح جاہل ہوں اور اپنی اس جہالت کی بدولت فانی ہوں۔
اور دیا ہی منش کے ناش کا کارن ہوتی ہے ورنہ وہ بھگوان ہوتا۔

میں بھگوان نہیں ہوں کہ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو جو ہے۔ مگر میں ان کا مستقبل تا حد نظر بہ آسانی دیکھ سکتا ہوں۔ آدمی کا مستقبل اس کے اپنے اندر سے ہی باہر پھوٹتا ہے، جیسے بیج سے پھول اور کانٹے۔ میں چپکے سے لوگوں کے باطن میں جا پہنچتا ہوں اور وہاں اُس کے ماضی سے مستقبل تک کے واقعات ایک بڑے فطری سلسلے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں جیسے اجنتا کی گپھاؤں میں تصویروں کا واقعاتی تسلسل۔ لوگوں کے سر مجھے پہاڑوں کے مانند نظر آتے ہیں اور اُن کے ذہنوں میں پہنچ کر مجھے لگتا ہے کہ میں سجے ہوئے غاروں میں نکل آیا ہوں جہاں پوری کی پوری کائنات بسی ہوئی ہے۔ اس کائنات کی خاموشی میں یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ ذرا دور سے کسی "بچے" کو ہنستا ہوا دیکھ رہے ہیں لیکن اُس کی ہنسی کی آواز کو سُن نہیں رہے اس خاموشی میں زندگی کی سبھی آوازیں جذب ہیں، اُن کے سُنائی دینے کا احساس ہوتا ہے مگر ہم انھیں سُن نہیں رہے ہوتے۔ اسی کیفیت کا نام شاید جنّت ہے جس کا بوجھ ہر آدمی ہر دم اس لیے سر میں اُٹھائے رکھتا ہے کہ آئندہ کبھی ہاتھ پیروں سے نکل کر ذرا چین کے لیے یہاں چلا آئے۔

مِس جیوا گاندھی یہاں کی مشہور ڈانسر ہے اور میری پرانی مریض ہے میں اپنے مؤکلوں کو مریض ہی سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ اپنے مستقبل کی ڈاکٹرنگ کے لیے ہی میرے پاس آتے ہیں، آج سے کئی برس پہلے وہ مشرق سے رقص کرتی ہوئی طلوع ہوئی اور اپنے مستقبل کا پہاڑ اُٹھائے شعلہ بار ناچتی ہوئی یہاں مغربی افق میں پہنچ کر تھم گئی کہ یہاں سے آگے کوئی راستہ نہ تھا ——— اور پھر اس کی توانائی ہاتھ پیروں سے نکل نکل کر شفق کے رنگوں میں بکھرنے لگی۔ اور وہ ساری کی ساری سر کے بل اپنے ذہن کی جنّت میں گھس آئی اور اس خوبصورت بستی کو غور سے دیکھتے ہوئے اُسے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ یہ جنّت اُس کے خوبصورت ماضی کے عزقاب کے مناظر پیش کر رہی ہے۔

جیوا اب اپنے ذہن کی جنّت میں ڈنلپ بیڈ پر سرہانے پہ ٹھوڑی جما کر اوندھی پڑی رہتی ہے اور ماضی کے پائل کی جھنکار سُن کر ہی اُسے اپنے حالیہ عمل و حرکت کا پتہ چلتا ہے۔

یہی اس کا مستقبل ہے، حال کے رتبے کے اندر ہی اندر اُس کا ماضی بظاہر آگے ہی آگے ناچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ عجیب فریبِ نظر ہے، آگے ہی آگے ناچتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر اس مقام سے آگے نہیں بڑھتا۔ میں جیوا کا رقص یہیں تک محدود ہے۔ ناچ ناچ کر جہاں تک اُسے پہنچنا تھا، وہاں تک وہ پہنچ چکی ہے، اب وہ اپنے ذہن کی جنت میں اوندھی لیٹی اپنی گزشتہ توانائیوں کا یہی مسلسل رقص دیکھتی رہے گی، اسی ایک آربٹ پر حرکت پذیر رہے گی۔

جیوا ہمارے کرۂ ارض کا دوسرا نام تو نہیں؟

جیوا کو ابھی تک اپنا مستقبل جاننے اور سنوارنے کا خبط ہے لیکن جس طرح دھرتی آج عین اُسی جگہ ہے جہاں وہ پچھلے برس اس وقت تھی۔ اسی طرح آئندہ برس بھی اس وقت یہیں آ پہنچے گی۔ جیوا کا ماضی ہی اُس کا پیچھا کرتے کرتے اُس کے آگے نکل جاتا ہے اور وہ اُسے اپنا مستقبل سمجھ لیتی ہے۔

دراصل میں جیوا سے متعلق اس لیے سوچ رہا ہوں کہ وہ ابھی دس پانچ منٹ میں یہاں آ رہی ہے۔

میرے مؤکلوں میں کوئی اسّی فی صد عورتیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عورت اپنی پیدائش پر ہی قسمت سے بیاہ رچا لیتی ہے اور بڑی ہو کر جب وہ کسی مرد سے دوسرا، تیسرا یا دسواں پیار رچانے کی تدبیر کرتی ہے تو قسمت اُسے باقاعدہ طلاق دینے کی بجائے ہر دفعہ ٹال جاتی ہے اور عورت کو اپنی ہر نئی تدبیر پہ یہی گمان گزرتا ہے کہ چوری چوری گناہ کی مرتکب ہو رہی ہے۔ نئی یا تدبیر عورت شاید اس لیے اپنے بدن پہ طرح طرح کی خوشبوئیں بسائے رکھتی ہے کہ اُسے اپنے وجود سے اپنے بستر کے پہلے ساتھی کی بُو کا احساس نہ ہو مگر اُس کا یہ لاأبالی ساتھی کبھی اچانک برسوں کی غیر حاضری کے بعد وارد ہو جاتا ہے اور مونچھوں کو تاؤ دے دے کر اُس کی طرف بڑھتا ہے تو اپنے بدن کی اس اوریجنل خوشبو کو اپنی جانب یوں لپکتے پا کر، خوشی سے باؤلی ہو ہو کر وہ اس سے کے آٹھ دس بچّے بیک وقت اپنے پیٹ میں جمع کر لینا چاہتی ہے۔ میں اپنے اس بیان کا کوئی سائنسی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا تاہم میرا یہ بیان اس حد تک سائنسی ہے کہ اس کا انحصار میرے گہرے مشاہدے پر ہے۔

عورت کا خوف اور خوشی، اُس کی سالم زندگی اُس کے چہرے پر رقم ہوتی ہے، جیسے مرد کی، اس کے ہاتھوں پہ۔ اس لیے عورتوں کے چہرے اور مردوں کے ہاتھ دیکھ دیکھ

کر میں انھیں قسمت کا حال بتاتا ہوں۔ لیکن اگر کسی مرد کا ہاتھ کٹا ہوا ہو تو میں اُس کے چہرے پر نظر جما لیتا ہوں اور کوئی عورت مجھے اپنے چہرے میں نظر نہ آئے تو اُس کا ہاتھ دیکھنے لگتا ہوں۔

مگر جیوا میرے لیے پرابلم بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنے چہرے سے خارج ہو کر ذہن میں گھسی رہتی ہے اور اُس کا چہرہ ایسے لگتا ہے جیسے ہر اُس عورت کا، جس کی طرف آپ کا دھیان چلا گیا ہو۔ اسی لیے جب اُس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو اُس کا خیال آنے کی بجائے میرا دھیان بے اختیار اُما کی طرف چلا گیا، جس سے میں نے اپنا پہلا عشق کیا تھا، مانو جیوا ایک بڑا پیارا فریم ہو جس میں ہر شخص کے محبوب کی تصویر عین فٹ بیٹھتی ہو۔ جیوا کے چاہنے والوں کی کثیر تعداد ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جیوا پر کسی اور عورت کا دھوکا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو عورت جیوا کے چہرے سے خارج ہو کر اُس کے وجود کے دردن خانے میں اوجھل ہے، وہی عورت ہر شخص کی محبوب ہے۔ وہی میری اور آپ کی اُما ہے۔ ہر عورت کے ذہن میں وہی ایک اُما ہوتی ہے۔

جس عورت کے ساتھ ہم اُس کے ذہن میں سوتے ہیں وہی ہماری محبوب ہوتی ہے اور جس کے ساتھ اپنے بستر پر، وہ بیوی یا طوائف جیوا نے اپنے مائینڈ میں بھی بستر بچھا رکھا ہے اور کمرے میں بھی، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ انتظار کرتی رہتی ہے اور اُسے معلوم ہے کہ اصل میں وہ ان لوگوں کی محبوب ہے نہ بیوی، وہ کسی وفادار طوائف کی طرح جسے جو کچھ چاہیے فراہم کر دیتی ہے اور اپنے دونوں خالی خالی بستروں پر پہلو بدل بدل کر بے حال ہو جاتی ہے۔

ناچ ناچ کر جیوا کا جی نہیں بھرتا اور اُس کے چاہنے والے اُس کا ناچ دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد اپنی مبہوت ستائش سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور اُسے چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیتے ہیں۔

مگر جیوا بدستور ناچتی رہتی ہے۔

جیوا واقعی ہمارا کرۂ ارض ہے، ہماری کائنات ہے اور ہم اپنے کام سے نہیں تھکتے بلکہ اپنی کائنات کی گردش کے تواتر کو اپنے بے عمل استعجاب سے دیکھ دیکھ کر ہم میں ہلنے کی سکت نہیں رہتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بجائے ہماری کائنات ساکن پڑی ہے اور ہم لگاتار گردش کر کر کے بے دم ہو رہے ہیں۔

"میرے چاہنے والے مجھے چھوڑ جاتے ہیں رام،" چند ہی روز کی ملاقات کے بعد

جیوا مجھے میرے پہلے نام سے بلانے لگی تھی ”کوئی نہیں جو میری حرکت کے کرب کی تاب نہ لا کر مجھے روک لے۔ سب میری بے قراری سے ذرا محظوظ ہوتے ہیں اور پھر چل دیتے ہیں۔“ (کیا دنیا آدمی کا ساتھ نہیں دیتی یا آدمی ہی دنیا کو چھوڑ جاتا ہے؟) کوئی نہیں رام، جو میرے تیز ہیجان وجود کو کھڑا کرے اور میری کھڑی کھڑی شبیہہ کو دل میں اُتار لے۔ کاش میں اپنا آپ ہونے کی بجائے اپنی تصویر ہوتی!

ہاں، متحرک چہرے بے نقش معلوم ہوتے ہیں اور ہم انھیں بھول جاتے ہیں مگر ہماری طرف مُنہ کیے کھڑی کھڑی تصویریں ہمارے دل و دماغ میں محفوظ رہتی ہیں۔ اپنے باپ کا وہی چہرہ میرے ذہن میں آباد ہے جو میں اپنی بیوہ ماں کے بیڈ روم میں اُس کی سیدھی اور پوری تصویر میں دیکھا کرتا تھا۔

”سکون کی خواہش مجھے ہر دم بیتاب رکھتی ہے رام، میرے اندر میری قبر بنی ہوئی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ جلدی جلدی مر کر، اس قبر میں سما کر جیتی ہو جاؤں، اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو —— تم جیوتشی ہو —— مجھے بتاؤ، کیا میری قسمت میں کوئی ایسا عاشق لکھا ہے جو مجھے کھڑا کر دے۔ یقین کرو میں صرف اس لیے گھومتی پھرتی ہوں کہ کوئی مجھے روک لے“ ——

اور جیوا کا یہی سوال میں آپ سب کو مخاطب کر کے دہراتا ہوں:

”ہے کوئی جواں مرد، جو گردش کرتی ہوئی دھرتی کو اپنے بازوؤں میں کس کر ٹھہرا لے؟ —— ہے کوئی —— ؟“

مگر میں ناحق آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ہیرو بننے کی خواہش ہے نہ فرصت۔ آپ تو چوبیس گھنٹے اپنے انحطاط کا سامان پیدا کرنے میں معروف رہتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ کام کرنا پڑ ہی گیا تو آپ مزے سے کوئی ڈرگ استعمال کریں گے تاکہ بے چین ہو ہو کر گھومتی ہوئی کائنات آپ کو ٹھہری نظر آئے۔ آپ اپنے ہر کام کو پورا کیے بغیر ہی پورا کر لیتے ہیں۔

جیوا ابھی تک کیوں نہیں آئی۔

ہمارے دور کا سارا کاروبار ڈرگز سے ہی چل رہا ہے۔ ہمارے فنانس منسٹر اچھی خاصی ڈرگ لینے کے بعد ہی اپنی قوم کا سالانہ بجٹ پیش کرتے ہیں اور حزبِ مخالف کے ان گنت غصیلے اعتراضات کا نہایت چین سے مسکرا مسکرا کر جواب دیتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ

کے اجلاس میں ڈرگ کے اثرات کے تحت ہی دشمن قوموں کے نمایندے بڑی نفرت سے ایک دوسرے سے نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔ اور تو اور، میری مرحوم سیکرٹری کو ——— (مرحومہ ڈرگ کے اوور ڈوز تیج سے ہی جاں بحق ہوئی) ——— اپنے شوہر سے لڑنا یا محبت کرنا درکار ہوتا تو وہ چپکے سے اپنی خوراک کی دگنی مقدار حلق میں انڈیل کر بآسانی اپنا ڈرامہ شروع کر دیتی۔

آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔ دراصل میں چوری چوری ان لائسنسیبل ڈرگز کا بھی دھندا کرتا ہوں۔ اب آپ سے کیا پردہ؟ دراصل یہی دھندا کرنے کے لیے میں نے جیوتش کا پیشہ (پاکھنڈ نہیں، میں واقعی بڑا ماہر جیوتشی ہوں۔) اختیار کر رکھا ہے۔ میرے پاس بے حساب کوکین، افیون، گانجا اور بھانت بھانت کی نشیلی جڑی بوٹیاں مشرقی ممالک سے پہنچتی ہیں اور میرے بیشتر ایجنٹ میرے جیوتش کے پرستار بن کے آتے ہیں اور میرا مال خود بخود کلیر ہو جاتا ہے۔ مغرب کے ہلکے پھلکے نشے ہم اہلِ مشرق کو بھلے لگتے ہیں لیکن اہلِ مغرب ہمارے مردانہ نشوں پر جان دیتے ہیں۔ شروع شروع میں مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میرا نشے کا یہ ڈھیر سا سامان کیوں کر کھپ جاتا ہے۔ آخر ایک ویک اینڈ کی شام کو میرا ایک متمول ویسٹ انڈین ایجنٹ ماتھو مجھے اپنے ایک اڈے پر لے گیا۔ روانگی کے وقت کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے جھجک جھجک کر تجویز کیا کہ میں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لوں۔ مانو میں کسی جدید یورپی یونیورسٹی کا ریسرچ اسکالر ہوں جو کھلی کتابوں سے ہی اپنی فکری ساخت کا جغرافیہ دریافت کر سکتا ہے۔ بیوقوف آنکھوں پر پٹی باندھتے ہی میری بالائی پیشانی شق ہو گئی اور میری جلد کے نیچے ذہن کی تیسری آنکھ ابھر آئی اور مجھے اپنا آس پاس بخوبی نظر آنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر ماتھو نے میرے من پسند سگریٹ کا پیکٹ ——— ان سگریٹوں کا کاغذ پوست میں بھگو کر سکھایا گیا تھا ——— جیب سے نکالا تو میں اپنی اشتہا کو روک نہ سکا۔ "لاؤ میں بھی پی لوں۔"

"تم ——— کیا تم ——— ؟" ماتھو میرے جادو سے پہلے ہی مرعوب تھا۔

"ہاں، تم میری آنکھوں پر دس اور پٹیاں باندھ کر مجھ سے پوچھو کہ تمھارے جسم میں کون کون سی رگ اس وقت کیسے اور کہاں ہل رہی ہے۔"

"او مائی گاڈ!" شیطان کے قائل ہو کر ہم بے اختیار خدا کا نام لیتے ہیں۔

اس نے میری پٹی کھول دی اور میری پیشانی کی جلد کے نیچے پٹ آز خود بند ہو گئے اور میں نے مسکراتے ہوئے پوست کا سگریٹ سلگا لیا اور کش لیتے ہوئے مسکرانا بھول گیا اور مجھے

سارے عالم کا چہرہ جیوا کے چہرے کے مانند بے نقش معلوم ہونے لگا۔

جب ہم شہر سے باہر پہنچے تو اندھیرا بہت گہرا ہو رہا تھا اور ہمیں سڑک صرف اتنی دور تک نظر آرہی تھی جہاں تک ہماری موٹر کار کی لائیٹ پہنچ سکتی تھی۔ ہمیں صرف اتنے ہی فاصلے تک نظر آتا ہے جہاں تک ہمیں روشنی کی فوری ضرورت ہو اور یہ مختصر سی روشنی ہمارے ساتھ ساتھ دوڑتی رہتی ہے اور جو کچھ ہم دیکھ لیتے ہیں وہ بھی، اور جو کچھ نہیں دیکھ پاتے وہ بھی فوراً پھر تاریکی میں ڈوب کر بے شکل ہو جاتا ہے۔ کیا زندگی اسی فوری ضرورت کا نام ہے؟ میری فوری ضرورت کیا ہے؟ ——— میری فوری ضرورت یہ ہے کہ میں اپنی گردش کرتی ہوئی کائنات کو ٹھہرا کر بیک وقت دیکھ لوں۔

ہے کوئی جواں مرد؟ ——— ہاں ہے! ——— دیکھو میں نے گلوب کو اپنے بازوؤں میں کس کر ٹھہرا لیا ہے۔ (پوست کا سگرٹ کتنا پیارا اور نشہ آور ہے)

جیوا! ادھر میری طرف دیکھو جیوا! اگر تم اپنے چہرے میں نظر نہیں آتی تو کیا مضائقہ ہے؟ میں تمہاری ہتھیلی میں تمھیں دیکھ لوں گا۔ اے میری محبوب، تم مرد ہو، تمہارا چہرہ تمھاری مٹھی میں ہے۔ اپنی مٹھی کھولو کہ میں تمہاری ہتھیلی کی لکیریں دیکھ کر تمھیں پہچان لوں۔ (جیوا کی ہتھیلی بھی اُس کے چہرے کے مانند لکیروں سے عاری ہے) ——— جیوا، تم عورت ہو کر بھی مرد ہو لیکن چونکہ تم عورت ہو اس لیے مرد نہیں ——— اے میری کائنات تم عورت ہو نہ مرد، تم صرف اپنا آپ ہو۔ اپنے تسلسل کا باعث خود آپ ہو، بے تقدیر ہو۔ یعنی تمہاری تقدیر اچھی ہے نہ بری، بس ہے ہی نہیں۔ تمھارے مستقبل کی پیش گوئی عبث ہے لیکن تم چاہو تو میں تمھارے ماضی کا حال بتا سکتا ہوں۔ تمھارے ماضی کی "پیش گوئی" بولو! بولو جیوا!

"جیوا ابھی تک کیوں نہیں آئی؟"

کئی کچے راستوں اور جنگل نما دشوار گزار ٹکڑوں سے گزر کر ہماری گاڑی اب چند کھنڈروں کے عین اندر جا رہی تھی۔

"آ گئے ہیں۔" ماتھو نے ایک بڑی پرانی، تنہا عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمارے کئی ایسے بے نام اڈے ہیں اور پولیس کو ڈاج کرنے کے لیے ہم احتیاطاً اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔"

عمارت کے اندر داوجھل کونوں میں چوبی زینوں سے اُترتے اُترتے ہم پھر آسمان کے نیچے آ گئے جہاں ایک لمبا چوڑا لان مصنوعی چاندنی میں ننگا نہا رہا تھا اور یہاں وہاں بچھی ہوئی کرسیوں پر یا نیچے لان ہی پر بہت سے لوگ بیٹھے، کھڑے یا لیٹے ہوئے تھے۔

ماتھو نے مجھے چند لوگوں میں لا بٹھایا۔

"آپ ہمارے مشہور جیوتشی رام پرشاد ہیں۔"

ایک ادھیڑ عمر شخص نے جس نے اپنی داڑھی مونچھ کو بے ترتیبی سے بڑھا رکھا تھا بھنگ کا گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

ٹھیک ہے آئیے، اُس نے میرے لیے بھی بھنگ کا آرڈر دے دیا "مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے ——— اگر آپ جیوتشی نہ ہوتے تو میری طرح پروفیسر ہوتے یا پروفیسر نہ ہوتے تو ہمارے رجی کی طرح۔" اُس نے اپنی بائیں طرف بیٹھے ہوئے ایک شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا جو گانجے کی چلم سے کش لیتے ہوئے خلا میں تیر رہا تھا۔ سائنسدان ہوتے، یا کچھ اور ہوتے ——— ہماری پہچان ہمارا پیشہ نہیں، ہم خود آپ ہیں ——— معاف کیجیے میں اپنا سوال بھول گیا ہوں۔"

"ایک بھنگ اور پی لیجیے پروفیسر، سب بھولا ہوا یاد آ جائے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ نشے میں مجھے پیدائش تک کی سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔"

"اور پیدائش سے پہلے کی؟"

"ہاں پیدائش سے پہلے کی بھی۔ مثلاً اگر اس وقت میں نشے میں ہوں تو مجھے معلوم ہے کہ اپنی پیدائش سے پہلے میں بھنگ کا جھاڑ تھا۔ میرا اپنا بیج ہی میرے نشے کا باعث ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ ——— میرا اپنا بیج ہی ——— میں کیا کہہ رہا تھا پلیز؟"

مجھ سے کوئی دو ہاتھ کے فاصلے پر ایک لڑکا کسی لڑکی کو سامنے بٹھا کر اُس کی طرف نظر جھپکے بغیر دیکھے چلا جا رہا تھا۔ یا شاید لڑکی اُسے اپنے سامنے بٹھا کر اُس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔

ماتھو نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں افیون کی ایک ایک گولی منہ میں رکھے ہوئے ہیں اور میڈی ٹیشن کر رہے ہیں۔

اُن کے ریاض کا معجزہ تھا کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

میں نے دوسری بار اُن کی جانب نظر اُٹھائی تو مجھے یہ عجیب سا احساس ہوا کہ لڑکی کے اندر لڑکا ہے اور لڑکے کے اندر لڑکی، اور یہ کہ اگر اس وقت اپنے اپنے گھر جانے کا خیال آئے تو وہاں جانے کے لیے وہ ایک دوسرے کے گھر چلے جائیں۔

"گیٹ آؤٹ!"، لڑکی کا معزز باپ لڑکے سے کہے گا۔ "تم سے کئی بار کہا ہے میری بیٹی کا خیال چھوڑ دو۔"

اور اُس کی باؤلی بیٹی کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اُس کا باپ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

اُس وقت تک یونہی نہیں بیٹھے رہو نوجوانو، جب تک تمھارے والدین تمھیں گھر جانے کو نہ آئیں تاکہ وہ تمھیں ساتھ لے جانے کی بجائے دراصل تمھارے محبوب کو لے جائیں اور یوں غلطی غلطی میں تمھارے محبوب کی محبت کی ذمہ داری کو قبول نہ کریں۔

"میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" ہم دونوں کے لیے بھنگ آگئی تو پروفیسر نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "کیا آپ واقعی جیوتشی ہیں؟"

جواباً میں غٹ غٹ اپنا بھنگ کا گلاس چڑھا گیا۔

"میرا سوال زیادہ اہم ہے۔" سائنس دان نے خلا سے لوٹ کر پوچھا۔ "کیا آپ کے ملک میں ہر شخص گانجا پیتا ہے؟"

میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو وہ فوراً بولا! "میں دراصل اپنے سوال کا جواب نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں اپنا سارا گانجہ دے دیجیے اور ہمارے سبھی جنگی ہتھیار لے لیجیے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا آپ کے پنج سالہ قومی پلان یا دس سالہ یا نہ جانے کتنے سالہ —— اخبار کی سبھی خبریں مجھے بریک فاسٹ کے بعد بھول جاتی ہیں —— کیا مشرق کے قومی پلان صرف اس لیے تیار کیے جاتے ہیں کہ اُن کے زیادہ سے زیادہ جنگی ہتھیار سٹور ہو سکیں؟"

پروفیسر نے اُس کا تعارف ڈرچی، کے نام سے کروایا تھا —— ڈرچرڈ ٹینس —— تو یہ ہے رچرڈ ٹینس - وہ اپنی حکومت کے لیے جدید ترین اور مہلک ترین ہتھیار ڈیزائن کرتا تھا۔

میں نے اپنی جیب سے نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ نشہ آور گولیوں کی ایک شیشی

نکال کر اُسے پیش کی اور مشرقی صناعی سے لہجے میں خلوص بھر کر اُس سے کہا۔ "آپ کبھی کبھی اس شیشی کی ایک گولی چوس لیا کریں منہ میں رکھتے ہی مریخ میں جا لینڈ کریں گے۔"

"تھینک یو!" اُس نے مجھ سے شیشی لے لی۔ "مشرق کا ہر باشندہ نشوں کا بادشاہ ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ کے عظیم کانٹی نینٹ میں لوگ تمباکو اور چونے کا پلاسٹر بنا کر کھا جاتے ہیں ——"

"اسی لیے ہر مشرقی کسی عظیم مانومینٹ سے کم نہیں۔" پروفیسر نے کہا۔ "میں ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں ——" پروفیسر کے دل میں جو بھی خیال آتا بھنگ سے اُڑ کر اُس کے منہ پر آجاتا۔ "مشرقیوں کو اسی لیے تو اتنی بھوک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ نشہ بہت کرتے ہیں؟ —— کیا شاندار موت ہے اگر آپ واقعی جیوتشی ہیں تو میرا ہاتھ دیکھ کر بتائیے کہ میں کسی مشرقی ماں کے پیٹ سے کب پیدا ہوں گا۔"

سائنس دان رچرڈ مین نے میری شیشی سے ایک گولی نکال کر منہ میں رکھ لی اور اُس کی نشہ آور لذت سے سرشار ہو کر کہنے لگا: مجھے یہ بتائیے مسٹر —— آئی ایم ساری —— آپ کو میں کس نام سے پکاروں؟"

میں نے اپنا نام بتایا۔

"مسٹر رام پرشاد، آدمی نے اپنی دُنیا کو تہ و بالا کرنے کے لیے اتنا سامان سجایا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ ہماری یہ سجی ہوئی موت ہمیں توڑ پھوڑ کر خود بھی جلد از جلد ٹوٹ پھوٹ جائے۔ جو ہونا ہے وہ فوراً ہو جائے تاکہ ہم از سر نو اپنی زندگی شروع کر سکیں۔ ہم اپنی تباہی کی طرف اتنا آگے بڑھ آئے ہیں کہ تباہ تو بہر صورت ہمیں ہونا ہی ہے۔ جتنی جلدی ہم تباہ ہوں گے اُتنی جلدی اپنی نئی زندگی شروع کر سکیں گے ——" میری گولی چوس چوس کر اُس نے مجھے عالمِ بالا سے آواز دی۔ "میں مارز یا مون یا نہ جانے کہاں سے بول رہا ہوں مسٹر رام پرشاد —— او۔ ڈر! —— مجھے بتاؤ، کیا میں سارے بم کرۂ ارض پر پھینک دوں؟ آرڈر دو پلیز! —— او۔ ڈر! ——"

"کیا آپ واقعی جیوتشی ہیں؟"

اور جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو پروفیسر کو اپنی شک بھری نظر سے دیکھتے ہوئے پا کر چونک پڑا۔

آپ کو تعجب ہوگا مگر جیوتش اور نشوں کی سوداگری میرے اضافی کام ہیں۔ میں ایک فری لانس بین الاقوامی ـــــــ جاسوس ہوں اور دُنیا کی کئی حکومتوں، اداروں اور شخصیتوں کی خدمات انجام دے چکا ہوں۔ جاسوسی میرا پیشہ ہے۔ اسی ٹوہ لگانے کے پیشے نے مجھے پہلے پہل جیوتش اور فلسفے کی طرف راغب کیا لیکن جیوتش ادرو چار دھارا میں جُٹ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں ہوا میں کھیتی باڑی کر رہا ہوں (میرا باپ ایک مشرقی کسان تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اکثر قحط کا شکار ہو جاتے ـــــــ اماوس کی وہ شام۔ ہمارا سارا بھوکا کنبہ بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ میری ماں گیتا پڑھ رہی تھی اور ہم جاں بلب ہو کر سُن رہے تھے، گویا مرنے سے پہلے ہم اپنی مکتی کا سامان ڈھو رہے ہوں بھوکوں مر رہے ہوں، ہمارے کھانے کے لیے حرف و چار ہی و چار ہوں۔)

میری جاسوسی دلچسپیاں بڑھنے لگیں تو میرے روحانی ایڈونچر ارضی نقوش اختیار کرنے لگے، جیسے روح مٹی میں آباد ہو کر جی اٹھتی ہے یا خیال چہرے میں پناہ لے کر شناسا سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ میری سُراغ رساں عادات کا نتیجہ تھا کہ اُما کا کھویا ہوا خیال مجھے اچانک جیوا کے چہرے میں مِل گیا۔

(جیوا کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔)

جیوا جب پہلی بار مجھ سے ملنے آئی تو ایسی شکل بنا کے، جیسے وہ میری کوئی مؤکل ہو، لیکن بے چاری کو معلوم نہ تھا کہ اُس کی کوئی بھی صورت تماشائی کے ذہن میں اُس کی اپنی خواہش سے اُبھرتی ہے۔ میں نے اپنی آدھی نظر سے اُس کی طرف دیکھا اور آدھی نظر سے اُسے دیکھنے کے لیے اپنے ذہن اور مجھے وہ اپنے مانند صاف کوئی جاسوس معلوم ہوئی ـــــــ اُما مجھے ڈھونڈ رہی تھی اور جیوا کسی غیر ملکی ڈپلومیٹ کی ہدایت پر اُس پُراسرار جاسوس کو، جس سے چند ٹاپ انٹرنیشنل سیکرٹ مہیا ہو سکتے تھے۔

میں جیوا کی طرف بیٹھ کر کے اُما پہ جھک گیا۔ جس طرح دو عورتوں کے سامنے آپ اُن میں سے ایک سے محبت کریں تو دوسری آپ کا پیار جیتنے کے لیے بے قرار ہونے لگتی ہے، ویسے ہی ایک ہی وجود میں دو عورتیں ہوں تو ایک کے لیے آپ کی چاہ دوسری کو بھی آپ کا شیدائی بنا دیتی ہے۔ اپنی طرف میری پیٹھ دیکھ کر پہلے تو جیوا کو بھی اپنی ڈیوٹی کا ہی خیال آیا۔ اُس کی چور نظریں سیکرٹ پیپرز کی دستیابی کے لیے ہر طرف اُٹھیں۔ اُس کی بیک وقت

سب کچھ دیکھ لینے کی بیتاب خواہش نے اتنا کھٹکا کیا کہ سویا ہوا آدمی بھی ہڑبڑا کر جاگ اُٹھے اور لاٹھی لے کر دوڑے مگر میں بڑے انہماک سے اُما پر جھکا رہا کیونکہ میں اپنا سیکرٹ پیپر کہیں نہیں رکھتا۔ میرے سبھی راز میرے اندر ہی مقفل پڑے ہوئے ہیں۔ دو فائیو آرم کے فلیٹ کے اگلے دو کمرے میرے جیوتش کے دفتر کے لیے وقف ہیں، اُن کے پیچھے دو اور کمرے نشوں کے دھندے کے لیے۔ مگر میرا جاسوسی کا سالم دفتر میرے ذہن میں آراستہ ہے۔ یہ سارا کام میں اطمینان سے یہیں بیٹھ کر کرتا ہوں —— جیوا نے آخر اپنی تلاش میں ناکام ہو کر تعجب سے میری جانب دیکھا اور پھر مجھے اور اُما کو باہوں میں باہیں ڈالے دیکھ کر متعجب ہونا بھول گئی، اور آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھی اور میری پیٹھ پر سر ٹکا کر دھیرے دھیرے لاچار محبت سے رونے لگی اور میں اپنا سر موڑے بغیر بدستور اُما کے جسم سے جھٹا رہا۔

اور یوں جیوا کو بے تدبیر کر کے میں نے اُس کی عادتوں میں دھیرے دھیرے رونا بھی شامل کروا دیا، وہ اپنی بے تدبیر تقدیر کی عادی ہو ہو کر مہذب بن گئی۔ میری جھوٹ موٹ کی مؤکل بن کر آئی تھی مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ میری سچ مچ کی مؤکل ہے۔ ہر سیارہ اپنی مرضی سے —— یا مرضی کے بغیر کسی اور سیارے کی کشش سے متاثر ہوتا ہے اور اسی فاصلہ آمیز کشش کے تاثر سے ہمارے عالم کا نظام قائم ہے۔

جیوا میرا سٹیلائٹ ہے۔

اگرچہ وہ اپنی مسلسل گردش سے تھکن کی شکایت کرتی ہے تاہم مجھے معلوم ہے کہ تھک تھک کر ہی اُسے اپنی زندگی کی توانائی فراہم ہوتی ہے۔

ایک بار مجھے اُس کا ایک بڑا تیز ڈانس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہر لحظہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھن چھن دائیں بائیں کہیں آف اسٹیج چلی جائے گی لیکن وہ کسی نہایت جامع تصویر کے مانند چوکھٹے کے اندر ہی اندر کوندتی رہی۔

اور مجھے پہلی دفعہ یہ خیال آیا کہ جیوا خواہ مخواہ تھم جانے کی خواہش کرتی رہتی ہے۔ جو حرکت چوکھٹے میں مقید ہو وہ قیام پذیر ہوتی ہے۔

"کاش میں تصویر ہوتی!"

"تم تصویر ہی ہو جیوا کیونکہ تم اپنی فطرت، اپنے معنی سے باہر نہیں ہو۔"

نہیں، میں چاہتی ہوں کہ مجھ ساری کی ساری کو کوئی جواں مرد اپنے اندر اُتار لے اس کے پاؤں میں میرے پاؤں ہوں۔ کندھوں میں کندھے، آنکھوں میں آنکھیں، سر میں سر۔"

"اگر ایسا ہو گیا میری جان، تو تم اُس جواں مرد کے تصور میں کیونکر آ پاؤ گی، تمھاری تصویر کیوں کر بن پائے گی؟"

میں نے اُسے اپنے سامنے کھڑا کر کے اُس کی گردن کی پشت پر اپنے ہاتھ انگلیوں سے باندھ لیے اور اُس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ لیں۔

"جیوا، ایک تصویر تمھاری طرح اپنی خواہش سے بے چین ہو ہو کر اپنے کینوس سے باہر آ کھڑی ہوئی تو ہر تماشائی کینوس کے قریب آ کر تصویر سے یہی پوچھتا، تصویر کہاں ہے؟"

میں نے دھرتی کو اپنے آر یپٹ سے باہر نہیں آنے دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جیوا نہایت اچھی جاسوس ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے اور اعتراف کر چکی ہے کہ وہ مجھے پھانسنے کے لیے میرے پاس آئی تھی مگر پھنس کر بیحد خوش ہوئی ہے۔ حالانکہ میری طبیعت بڑی شکی ہے مگر اُس کے بھروسے نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ جو شخص آپ کے دل میں بسنے لگے اُس پر شک کرنا کنفیوزڈ تھنکنگ کی علامت ہے میں نے جیوا کو اپنا شریکِ کار بنا لیا ہے اور اپنے ذہن کے دفتر کا کچھ حصّہ بڑے اعتماد سے اُس کے ذہن میں لاد دیا ہے۔

(وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ —— کہیں —— کہیں —— ؟)

اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر میں اُسے کافی اہم کام سپرد کرنے لگا ہوں، مثلاً یہی کام، جس کی تکمیل کی رپورٹ کرنے کے لیے اُسے اب تک میرے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کام خطرناک ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اسے بخوبی انجام دے چکی ہو گی —— پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ اس کام سے خود ہی نمٹوں لیکن اُس کا ایک دوست اتفاق سے اسی ہوائی جہاز سے سفر کر رہا ہے —— مگر پورا قصہ تو میں نے ابھی تک آپ کو سنایا ہی نہیں ——

ایک بڑی حکومت اس ہوائی جہاز کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہے کیونکہ اس میں کسی پسماندہ مُلک کے دو بڑے اہم لیڈر سفر کر رہے ہیں جن کی زندگی اُس بڑی حکومت کے مفاد کے منافی ہے۔ میرے مؤکلوں نے مجھے ایک بڑا خوبصورت کھلونا بھیجا ہے، ایک بوڑھا بابا، جسے سیدھا کھڑا کیا جائے تو وہ از خود ایسے مضحکہ خیز انداز میں سر ہلانے لگتا ہے کہ ہنستے ہنستے ننھے منّے بچّوں کے آنسو نکل آئیں اور —— اس کھلونے کے اندر کچھ اس صفائی سے

ایک ٹائم بم چھپا کر رکھا ہوا ہے کہ اگر بابا کا کلیجہ پھاڑ کر اسے دیکھ بھی لیا جائے تو بم کھلونے ہی کی کوئی کل معلوم ہو ——— فلائیٹ کے دو گھنٹے بعد جب ہوائی جہاز ایک غیر آباد پہاڑی سلسلے سے گزر رہا ہوگا تو یہ چھوٹا سا ٹائم بم فلک شگاف دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اس سے پہلے کہ کسی کو معلوم ہو کہ دھماکہ کیسے ہوا ہے، ہوائی جہاز اپنے بہتّر مسافروں، اور اسٹاف کے ساتوں اراکین سمیت پاش پاش ہو کر جلتا دہکتا نیچے پہاڑوں میں جا گرے گا۔

جیوا نے یہ فرض ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا:

"میرا دوست، اُس کی بیوی اور اُن کا بچّہ اسی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔" جیوا کی آواز لاشخصی عزم سے ذرا ٹوٹ سی رہی تھی۔ "میں یہ کھلونا اُن کے بچّے کو پیش کروں گی۔"

"تم ——— ؟!"

"ہاں، فرض کی ادائگی میں کوئی کسی کا بھائی، باپ یا دوست نہیں ہوتا۔"

وہاں، کرشن کنہیا کا بھی یہی اپدیش ہے بے لاگ ہو کر اپنا فرض ادا کرو۔ ہماری زمین کی پہچان نظامِ شمسی میں اپنے فرض کی انجام دہی سے وابستہ ہے۔"

میں خوش ہو گیا۔

"فرض کرو جیوا، تمھارے فرائض میں اتفاق سے میں ہی حائل ہو جاؤں تو۔"

"کیا تم چاہتے ہو، میں یہ کہوں، میں تمھیں بھی ضایع کرنے سے باز نہیں آؤں گی ——— تم شاید یہ سُن کر حیران ہو جاؤ کہ میں بھی یہی کہنا چاہتی ہوں!"

میں حیران ہونے کی بجائے خوف آمیز تحسین سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے جیوا، تم ہی یہ فرض انجام دو۔ بھگوان تمھاری حفاظت کرے!"

"بھگوان بے چارہ تو بیمار پڑا ہے، وہ ہماری حفاظت کیا کرے گا۔" اس ہلکے پھلکے موضوع سے وہ اتنی متانت برت رہی تھی کہ میرا جی چاہا کہ میں ہنس دوں۔

"میں تو یہ چاہتی ہوں رام، کہ ہمارا بوڑھا اور بیمار بھگوان اب چل بسے، تاکہ ہمارے جینے کی پوری ذمّہ داری ہم ہی پہ عائد ہو ———"

"کبھی کبھی جیوا معمولی باتوں کو اتنے اجنبی اور ڈرامائی سیاق وسباق سے جوڑ دیتی ہے کہ اَن پروفیشنل معلوم ہوتی ہے۔

بھگوان کی بیماری، جینے کی ذمّہ داری ——— اس کا بھلا یہاں کیا موقع ہے؟

بڑی محبت سے اپنے دوست کے بچے کا بوسہ لو، پھر اُس کے بھول پن اور خوبصورتی پر ریجھ ریجھ کر ایک اور بوسہ لو اور پھر ——— ہیلو، بے بی! یہ لو بوڑھا بابا! یہ دیکھو، کیسے سر ہلا رہا ہے! ——— ہہ ہہ ہا ہہ! ——— یہ لو! ——— ہہ ہہ ہہ ہا! ——— دھا دھم ——— م ——— م م! ——— بچہ ہوائی جہاز کی سیٹ میں لیٹے لیٹے سو گیا ہے اور سوتے میں بھی بوڑھے بابا کا ہلتا ہوا سر دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے اور بڑے پیار سے بابا کو اپنے دل کے قریب لے آیا ہے ——— دھا ——— دھم م م! ———

بیمار خدا کے سرہانے جیوا کھڑی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے!

یہ اتنے سارے لوگ! ——— یہ طالب علم، یہ اپنی انجینیرنگ کی تربیت سے فارغ ہو کر وطن لوٹ رہا تھا۔ اس کے بوڑھے ماں باپ پھولوں کے ہار لیے، اپنی بوڑھی رگوں میں ہوائی جہاز کی گھوں گھاں محسوس کر کر کے آسمان کی خالی خالی نیلاہٹ میں تک رہے ہیں اور یہ ادھیڑ عمر ٹورسٹ جو روزمرہ کے کاموں سے تھک کر زندگی سے چھٹی لے کر چلا آیا اور یہ بزنس مین، یہ سِول سرونٹ، یہ ہاؤس وائف، یہ معصوم، خوابیدہ بچہ، یہ اس بچے سے بھی معصوم اس کے والدین، یہ بہتر لوگ، یہ بہتر کروڑ لوگ، بہتر ارب یا بہتر کھرب لوگ۔ زندگی کا یہ گنجان بازار، یہ پاپولیشن ایکسپلوژن! ایک چھوٹے سے بم کے ہیبت ناک دھماکے نے اس ساری ٹہمنگ لائف کو اس کی محفوظ وسعتوں کے اندر ہی ختم کر دیا ہے۔ موت کی بے نام وسعتوں میں زندگی سے بھاگے ہوئے اتنے زیادہ مہاجرین کے سایے پھڑپھڑانے لگے ہیں کہ مر کر بھی جینا ناممکن ہو گیا ہے!

جیوا میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے! دھرتی ہر بھونچال کے بعد ویسی ہی نو بہ نو نکل آتی ہے، کنواری، شگفتہ، نمو خیز! ——— جیوا کی بکھری مسکراہٹیں دیکھ دیکھ کر میں بالکل بھول جاتا ہوں کہ وہ اپنے بیمار بھگوان کی موت کی دعائیں مانگ مانگ کر اس کی تیمار داری کر رہی ہے، یا میرا سن رسیدہ باپ مر رہا ہے اور میں اُس سے غافل ہو کر اپنی محبوبہ کی طرف دیکھے جا رہا ہوں جو میرے باپ کو بہلا بہلا کر بڑی محبت سے زہر پلا رہی ہے اور جس کی مسکراہٹیں مجھے دیکھے جا رہی ہیں۔

اُما! اُما! آؤ، بوڑھے کو مرنے دو! آؤ، ہم ساتھ کے کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے ایک بستر پر لیٹ جائیں۔ آ ؤ ۔ ؤ!

(نہ جانے جیوا ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ ہوائی جہاز کو روانہ ہوئے اب پورا ایک گھنٹہ ہو چکا ہے —— کہیں —— ؟ —— نہیں! ——)

ک —— ٹک!

اپنے آفس سے لفٹ کے رُکنے کی آواز سُن کر میں نے اپنے جسم سمیت دروازے کی طرف پرواز کی ہے۔ وہ آرہی ہے! اپنا کام ختم کر کے آرہی ہے!

وہی آرہی ہے!

مگر —— م —— ؟!

میں نے اپنی آنکھیں جھپکی ہیں۔

جیوا پولیس کی وردی میں ملبوس ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک پستول تنا ہوا ہے، جو موت کی طرح چل جانے کو بے قرار ہے، اور اس کے ساتھ چند اور پولیس آفیسر ہیں۔ اور اُن کے ہاتھوں میں بھی پستول تنے ہوئے ہیں۔ وہ سب میرے جیوتش کے آفس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے گھومتے ہوئے ملبری گلوب پہ کھڑا گرنے سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ میری تقدیر کی طرح میرا یہ جیوتش کا دفتر گھوم رہا ہے اور میں اس کے پیچھے اپنے نشوں کے دفتر کی طرف بھاگ جانا چاہتا ہوں اور پھر وہاں سے اپنے پرائیویٹ سوٹ میں، جہاں میں کسی بڑے نیک آدمی کے مانند اُما کے ساتھ اپنی پرائیویٹ اور بے ضرر زندگی بسر کرتا ہوں۔ مگر اُما تو پولیس آفیسر بنے میرے جرائم کا حساب چکانے آرہی ہے۔

اُما، تم جانتی ہو میرے جرائم کا ذمہ دار تمھارا بھگوان ہے! اُما میں برا ہوں مگر میری بُرائی میری نہیں، تمھارے بیمار بھگوان کی ہے، صرف میری نیکی میری ہے! اُما! اُما —— اُ —— م ——!

"ہینڈز اپ!"

میرے کوٹ سے نیچے ہمیشہ دائیں کندھے سے چھاتی کی طرف بجلی کا ایک بٹن لٹکتا رہتا، میرے اعمال کے حساب کتاب کا فرشتہ

"ہینڈز اپ"

ہاتھ اوپر کرتے ہوئے میں نے یہ بٹن دبا دیا ہے اور کچھ سوچنے سے پہلے ہی الیکٹرک کرنٹس سے میرا ذہن، میرے کاروبار کا یہ سارا دفتر خاکستر ہو گیا ہے!

اور میری روح فائر آرم، کی کھڑکی سے پرواز کرنے سے پہلے جیوا کی آواز سُن کر

رک گئی ہے۔

"بہت بڑا اسپائی تھا مگر لائف کو ڈیتھ کا ہائیڈ آؤٹ سمجھ بیٹھا! ——"

میں نے جی بھر کر جیوا کی طرف دیکھا ہے، اس فریم میں دھڑکتی ہوئی اُما کی طرف!

زندگی اپنے آربٹ میں گھوم رہی ہے اور تھک کر دم بہ دم تازہ دم ہو رہی ہے۔

موت کا ایک نقطہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

میں نے بے اختیار چاہا کاش اس آربٹ میں پھر سے داخل ہو سکوں! —— مگر میرا جسم کہاں ہے؟ —— دل کے بغیر میری موت کیونکر دھڑکے گی؟ دماغ کے بغیر میں اپنی زندگی کو کیوں کر محسوس کروں گا؟ —— میرا جسم مجھ سے چھن چکا ہے —— میرا جسم مجھ سے ——!

میرا بے جسم بھوت ایک بے آواز پھریری سے بے سمت کہیں اُڑنے لگا ہے۔

میں نے زندگی بھر موت کو بے سود ڈھونڈا ہے اور مر کر بغیر کسی کوشش کے موت کا سُراغ پا لیا ہے!

OO

شروَن کمار ورما

وہ کئی دن بعد اپنے کمرے سے نکلا تو گھر کے تمام افراد ایک دم بدل چکے تھے۔ یہ حقیقت تھی یا اس کا وہم ——— بہر حال اسے ایسا احساس ہوا تھا۔ سب لوگ یوں چونکے تھے جیسے انھونی ہو گئی ہو۔ اُس نے چوکھٹ پر کھڑے ہو کر خالی آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا — کیا وہ اُسے ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے، کیا وہ ان کی امّید کے خلاف نمودار ہوا ہے ——— کیا اُس کا وجود اُن لوگوں کے لیے نہ ہونے کے برابر ہے ———؟

سب نے اسے حیرت و خوف سے دیکھا۔ اُن کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں گہری اُداسی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر پر کوئی سانحہ گزر گیا ہے۔

"تمھیں کہیں جانا ہے۔ ؟" باپ نے نرمی سے پوچھا۔

تلاش

"معلوم نہیں" وہ بولا۔ "سب فیصلے تو آپ کرتے ہیں"

"جہاں تمھاری مرضی ہو جاؤ" ——— ماں نے محبت سے کہا۔ "ہمارے پاس بیٹھو گے ؟"

"آپ کے پاس ہی لیکن آپ لوگ تو مجھے پہچانتے ہی نہیں"

"کیسی باتیں کرتے ہو، کون نہیں پہچانتا تمھیں۔ تم" ——— وہ جیسے ڈر گئی۔ اُسے اپنی بات پر یقین نہ رہا ہو ———

"وہ آج بھی نہیں ملا ——— اور اس کے بغیر میری کوئی پہچان نہیں، میں ادھورا رہ گیا ہوں۔ یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ وہ مجھ سے کہہ کر بھی تو نہیں گیا۔ بس، چپکے سے چلا گیا ——— میں تھانے گیا تھا رپٹ لکھوانے، ان لوگوں نے مجھے گالیاں دیں اور دھکے دے کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے ———" وہ باپ

کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"شیام۔" اُس کا باپ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"شیام مجھے نہیں ملتا۔ اُس روز آپ لوگوں نے اُسے پھٹکارا تھا۔ وہ مجھے لے کر نوکری کی تلاش میں کئی جگہوں پر گیا، اُس کے ساتھ میں تھا۔ کوئی سفارش نہیں تھی، نقد روپیہ نہیں تھا۔ ان لوگوں نے بھی اس کی بات نہیں سُنی۔ باہر آکر اس نے میرے کان میں کہا کہ اُسے سخت بھوک لگی تھی اور وہ بھوک مٹانے کے خیال سے مجھ سے جُدا ہو گیا۔ میں دیر تک دھوپ میں کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ سورج میرے اندر گھسا جا رہا تھا اور باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ آتے جاتے لوگ سیاہ دھبوں میں بدل گئے۔ وہ سڑک دونوں طرف جگمگاتی، شاندار کوٹھیاں، آرائشی پیڑ پودے اور ان کوٹھیوں میں رہتے لوگ سب غائب ہو گئے۔ ایک سیاہی رہ گئی، جب یہ سب کچھ واپس آیا تو میں سڑک کے کنارے پڑا تھا اور لوگ مجھے گھیرے کھڑے تھے۔ ہر شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتا، میں کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ میں نے انھیں بتانا چاہا لیکن جو میں انھیں بتانا چاہتا تھا وہ تو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور واپس نہیں آیا تھا —— اب تک نہیں ملا مجھے —— اور میں اُسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ میں جس سے کہتا ہوں وہ ہنسنے لگتا ہے، مجھ پر یقین نہیں کرتا —— لوگ کیوں مجھ پر یقین نہیں کرتے —— میں جھوٹ تو نہیں بولتا، غلط بیانی تو نہیں کرتا ——"

"شیام، یہ سب تمھارا وہم ہے۔ بھوک اور دھوپ کی وجہ سے تم بیمار ہو گئے تھے، ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اس کے باپ نے سمجھایا۔

"دل مت ہارو ——" ماں بولی

"ہار، جیت میرے لیے ختم ہو چکی ہے۔"

"اس نے بڑا گہرا گڑھا کھودا ہے۔" اس کے چھوٹے بھائی نے باپ کو بتایا۔

باپ نے بے بسی سے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور ملبے کا اونچا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اس نے مایوسی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ رونے لگی۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔" باپ نے بیوی کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ایک ڈاکٹر کہتا ہے اسے کام پر لگا دو، دوسرا کہتا ہے اس کی شادی کر دو، تیسرا کہتا ہے اسے خوش رکھو۔

جیسے یہ سب کچھ صرف ہمارے بس میں ہو۔"

"پہلے مجھے وہ مِل جائے، جو مجھے اچانک اکیلا چھوڑ گیا ہے۔" وہ گھر سے باہر نکل گیا ——— "میں اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ دیر تک سڑک پر گھومتا رہا۔ غور سے ہر راہ گیر کو دیکھتا، ایک دو کو اُس نے چھو کر دیکھنے کی کوشش کی، وہ بدک کر پرے ہو گئے۔ اس کا لباس، صورت اور حالت ہی کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر دُور ہو جاتے۔

"کیا تم بھی میری طرح خالی ہو ——— ؟" اس نے ایک شخص سے پوچھا۔

"بکو نہیں ———" وہ چلا گیا۔

وہ ہنس دیا۔ اس نے سوچا۔ یہ لوگ بھی اُس کی طرح شیشے کی دیواروں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں اور کسی سے آزادانہ مِل یا بات نہیں کر سکتے۔ ان سب کے گرد حصار کھنچے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یا تو اندر سے خالی ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں ——— اسے دکھ تھا کہ ان تھوڑے سے دنوں میں باہر سب کچھ بڑی تیزی سے بدل گیا تھا۔ ہر شخص ایک سا تھا۔ وہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے سوچا، شاید یہ سانحہ صرف آدمیوں پر ہی گزر رہا ہے ——اس نے ادھر سے توجہ ہٹا کر مکانوں اور دوکانوں کو دیکھا ——— سب ایک سے تھے ——— کمال ہے! ایک ہی رنگ: زرد، کہیں گہرا، کہیں ہلکا، سڑک کے کنارے اینٹوں کے پنجرے دُور تک چلے گئے تھے، جن پہ تختیاں لٹک رہی تھیں ——— ناموں کی تختیاں اور ان میں سے لوگ آجا رہے تھے۔

وہ ایک شخص کو، جو شکل سے مدبّر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی، روک کر بولا:

"پچھلے دِنوں آپ یہیں تھے یا باہر گئے ہوئے تھے ———"

اُس شخص نے حیرت سے اُسے سر سے پانو تک دیکھا اور بولا:

"آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں ———"

"میرے سوال کا اس سے کوئی تعلق ہے کیا؟"

"میرا راستہ چھوڑ دو۔" وہ اُسے دھکیلتا ہوا چلا گیا۔

اُس نے دہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سوچا کہ وہ غلط نہیں ہے۔ واقعی سب

کچھ بدل گیا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آدمی کو نہ پہچانے۔ ضرور ان چند دنوں میں کچھ ہوگیا ہے۔ وہ کب سے غیر حاضر ہے؟"

اُس نے سر اُٹھایا۔ وہ عینک والا شخص چلا جارہا تھا۔ وہ بھی چلنے لگا۔ تھوڑی دُور جاکر اُس نے دیکھا کہ وہی شخص سامنے سے چلا آرہا ہے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ پہلا آدمی جارہا تھا —— وہ اُلجھ گیا —— وہ جا بھی رہا ہے اور آبھی رہا ہے۔ اس نے آنے والے کو روک کر اپنا سوال دہرایا۔

"میں تو اس شہر میں اجنبی ہوں" وہ شخص معصومیت سے بولا۔

"کمال ہے!" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "کس سے پوچھوں؟"

اجنبی اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اُس کی نظر ایک مضبوط ڈیل ڈول والے باوردی شخص پر پڑی، جو بید لیے مستعدی سے کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس شخص نے اسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔

"آپ پہرے پر ہیں؟"

"ہاں —— کیوں ——!"

"پھر تو آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کب اور کیسے ہوا"

"کیا کب اور کیسے ہوا؟"

"یہ شہر، یہ لوگ، کیسے بدل گئے —— ؟"

"بدل گئے! تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے نا۔!"

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے"

"جاؤ اپنا کام کرو" اس شخص نے ڈانٹ دیا۔

وہ ہٹ کر شوکیس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس نے شیشہ چھوکر دیکھا اندر جھانکا اور نعرہ بلند کیا۔

"مِل گیا، مِل گیا"

"کیا شور مچاتا ہے؟" باوردی شخص گرجا۔

"وہ دیکھو" —— اُس نے شوکیس میں کھڑے، خوبصورت پُتلے کی طرف

اشارہ کیا —— "وہ میں ہوں —— ڈھونڈ لیا۔" وہ پہرے دار سے مخاطب ہوا۔
"بہت عرصہ سے اسے تلاش کر رہا تھا۔ میں یہاں سے گیا تو پیچھے سب کچھ بدل گیا تم بھی شاید سو گئے تھے۔ خیر اب سب ٹھیک ہو جائے گا"——

پہرے دار نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نظر ایک بار پُتلے کی طرف بھی گئی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ پہریدار ہے، اس نے حکم دیا:
"جاؤ یہاں سے۔"

"کون جائے؟" وہ بکھرا رہا۔ "میں اکیلا کیسے جا سکتا ہوں۔ اسے بھی نکالو۔ اس کے بغیر میں ادھورا ہوں۔"

پہرے دار نے اُسے بازو سے پکڑ کر سڑک پر دھکیل دیا۔

ایسا کئی بار ہوا تھا۔ سڑک پر وہ منہ اٹھائے چلنے لگا اور سوچنے لگا لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کیا یہ سب ہی ادھورے تو نہیں۔ مکمل ہوں تو سمجھیں۔

راستے میں وہ ایک شکستہ دیوار پر چڑھ گیا اور چاروں طرف دیکھا۔ وہ شہر سے دُور نکل آیا تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ تھی اور بخار میں اسے یاد آیا، یہاں پہلے باغات ہوا کرتے تھے، ٹھنڈے سایے اور خوشگوار ہوا کی سرگوشیاں۔ لوگ لکڑیاں کاٹ کر لے گئے اور سب کچھ اُجڑ گیا۔

وہ دیوار سے اُترا آیا اور درختوں کی قوس کی طرف چلنے لگا جو بہت دُور تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دریا کے کنارے پہنچ گیا جہاں سورج ڈوب رہا تھا۔ اسے دکھ ہوا۔ اب اندھیرے میں وہ کیا کرے گا۔ وہ لوٹ آیا۔ واپسی میں اُسے وہ لڑکی ملی جو بار بار اُس کو ذہن نشین کرانا چاہتی تھی کہ وہ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور کہ وہ اس کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے اور کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر وہ ہنسا۔

"محبت! عجیب بات ہے، لوگ اب بھی محبت کرتے ہیں۔"

وہ رونے لگی۔

"رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم بھی شیام کو ڈھونڈ رہی ہو۔ میں بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ اس کے ملنے پر ہی کچھ ہو سکے گا۔"

وہ اُداس ہو گئی۔ وہ اُسے چھوڑ کر گھر آ گیا، اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

کئی دن تک وہ باہر نہیں آیا۔ گھر والوں نے جب کوئی آواز بھی نہیں سُنی تو دروازہ توڑ دیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ اس گہرے گڑھے میں پڑا تھا جو اس نے کھودا تھا۔ سب نے اس کا نام لے کر پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

"اسے نکالو" ماں نے پریشانی سے کہا۔

لیکن کوئی گڑھے میں جانے کو تیار نہیں تھا۔

OO

امر سنگھ

گھرڑ ... ڑڑر ——

اسکوٹر کا دبہ دبہ شور ——

ایک سُرمئی فیتہ دُور تک بچھا ہُوا۔ مجھے معلوم ہے [یہ علم مجھے یہاں سے ہر روز گزرنے کی وجہ سے حاصل ہے] کہ میرے دونوں طرف مکان اور عمارتیں جامن اور املتاس کے پیڑ پیچھے کو بھاگتے جارہے ہیں مگر عدیم الوجود ہیں۔ وجود ... صرف اُن نادر پرندوں کے انڈوں کا ہے جو ہوائی جہاز کے ذریعے نیوزی لینڈ سے لائے گئے ہیں اور جنھیں میں نیشنل زولوجیکل پارک کی نرسری میں انکو بٹیر میں ... لگا کر آرہا ہوں اور وجود ہے ان کے موہوم مستقبل کا —— اور —— اور ... اس سرمئی فیتے کا جو میرے سامنے دُور تک بچھا ہُوا ہے میرے

آپٹکس

دونوں ابروؤں کے درمیان ایک غیر مرئی سوراخ ہے جو بڑی تیزی سے اس فیتے کو نگلتا جارہا ہے۔ یکلخت یہ فیتہ ٹوٹ گیا ہے۔ ایک دم بے حد چوڑا ہو گیا ہے۔ تحت السطح پانی پھوٹ نکلا ہے اور سڑک میں گڑھا پڑ گیا ہے۔ نادر انڈے، عدیم الوجود ہو گئے ہیں۔ گڑھے کو اسکوٹر کا مڈگارڈ نگل گیا ہے اور اب بڑی تیزی سے اس فراخ فیتے کو ہڑپ کرتا جارہا ہے۔

وہ کون میرے گھر کے پھاٹک پر کھڑی ہے؟ یہ —— یہ تو میری بیوی ہے جو پھاٹک پر دونوں کُھنیاں ٹکائے اُس کے سہارے جھول رہی ہے اور میرا انتظار کر رہی ہے۔ یہ اس کا معمول بن چکا ہے۔ جب سے میرا لڑکا اسکالرشپ پر ہاورڈ چلا گیا ہے اور لڑکی کو انڈور میں بی ایس سی میڈیکل میں داخلہ مِل گیا ہے۔

کیوں پھکاوے دیتے ھو دوست؟ یہ تو تمھاری بیوی ھے ھی۔ لیکن وہ کون ھے؟ وہ جو پھاٹک کے دوسرے پٹ کو بغل میں دبائے کھڑی ھے تمھاری بیوی کے ساتھ ——— اُس کے ساتھ باتیں کر رھی ھے؟

وہ ——— وہ ——— وہ ——— یہ لو وہ پیچھے مُڑ کر دیکھ رھی ھے۔ میری بیوی نے مجھے آتے دیکھ لیا ھے شاید اور شاید اُس نے بھی بتایا ھے۔ اور میری بیوی ——— میری بیوی نے کُہنیاں پھاٹک پر سے اُٹھالی ھیں۔ اب غالباً اُس کے چہرے پر سے انتظار کی بے زاری اور اُداسی کے تاثرات مِٹ گئے ھوں گے۔ اور میری بیوی . . . میری بیوی . . .

پھر بیوی ——— مگر وہ ———

وہ . . . ھاں وہ ھماری نئی پڑوسن ھے جو صرف چار دن ھوئے یہاں آئی ھے اور آتے ھی میری بیوی کے ساتھ گھل مِل گئی ھے اور میری بیوی ———

پھر وھی بیوی کی رٹ! تم جتنا جی چاھے پہلو بچاؤ مگر میں تمھیں ——— آخر تم مان کیوں نہیں لیتے کہ یہ عورت روزِ اوّل سے ھی تمھارے ذھن پر سوار ھو چکی ھے اور تم دُور سے ھی محض اُس کے ھیولے ھی سے پہچان لیتے ھو۔ آج بھی اس کے ھیولے پر ھی نظر پڑتے کے ساتھ تمھارے دِل کی حالت غیر ھونے لگی تھی۔ کیونکہ تُم اسے پہچان گئے تھے۔ نھیں تو . . . نھیں تو . . .

جھوٹ مت سوچو ——— !

نھیں . . نھیں ——— ھاں! شاید یہ ٹھیک ھے۔ اس کے ھیولے کو دیکھتے ھی دیکھتے کیا محض اِس کا تصوّر کرتے ھی تمھارے دل کی حالت ایک ثانیے کیلئے کچھ ایسی ھو جاتی ھے جیسے مچھلی کے حلق میں کانٹا پھنس گیا ھو۔ ایسے جیسے شکاری نے اُسے پہلا جھٹکا

دیا ہو ـــــ جیسے لفٹ ایک دم نیچے اُترنے لگے۔

لیکن یہ بات غلط ہے کہ وہ میرے اعصاب پر سوار ہے۔ غلط مطلب نہ لو وہ میرے اعصاب پر سوار بھی ہو تو کیا؟ یوں تو میرے اعصاب پر یہ اسکوٹر بھی سوار ہو گیا تھا۔ کافی عرصہ سوار رہا تھا اور پھر جب میں اسے خریدنے کے قابل ہوا تھا تو اُس وقت تک یہ میرے اعصاب پر سے اُتر چکا تھا۔ اور پھر میں نے اِسے یوں خرید لیا تھا جیسے ریستوران میں چائے کا پیالہ پی لیا جاتا ہے، محض دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنے کے لیے۔

تو... تو... تمہارا مطلب ہے...؟

میں پھاٹک پر پہنچ گیا ہوں۔ اسکوٹر کا شور بند ہو گیا ہے۔ پڑوسن کا وجود شدت سے نمایاں ہو گیا ہے۔ میری نظر اُس کے سراپا سے پھسلتی ہے اور اُس کے بیٹ پر آٹھہرتی ہے۔ ایک بار... دو بار... تین بار اور پھر بار بار...

اُف میرے خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرا سر کندھوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے جھٹپٹا رہا ہے۔ یہ مچل رہا ہے کہ بھاگ کر۔ اُڑ کر اِس بیٹ کے ساتھ جا لگے اور پھر وہیں ٹکا رہے۔ آہ! میرے کندھے شل ہوئے جا رہے ہیں۔ بے بس۔

"آپ آ گئے؟"

"ہاں!"

[شکریہ میری جان! تم نے میرے کندھوں میں نئی جان ڈال دی ہے]

نظر ایک بار پھر سارے پیکر کا طواف کرتی ہے اور کریپ کی قمیص کے پردے میں سے نمایاں ہوتے ہوئے مدوّر بیٹ پر جا لگتی ہے۔

اُف! یہ پیٹ کس قدر حسین ہے! واہ۔ کیا رٹا رٹایا جملہ ہے۔
حُسن ــــــ کس قدر مبہم لفظ ہے، کس قدر بے معنی۔ کسی بھی حُسن کا اظہار کرنے کے نا اہل ــــــ حُسن تو ایک مابعد الطبیعاتی رشتہ ہے جو کوئی مخصوص لمحہ فرد کی شخصیت اور مفعول کے درمیان قائم کرتا ہے [یہ عورت اِس کا پیٹ کیا عجیب عجیب باتیں سمجھا رہا ہے۔ کیسے نئے نئے احساس دِلا رہا ہے]
حُسن کِس شِدّت کے ساتھ انفرادی ہے اور لمحاتی بھی۔ جیسے یہ مدوّر پیٹ میرے لیے ــــــ جیسے اِمُو کا انڈہ کریٹ کے بیچ رُوئی میں ٹِکا ہُوا جو آج ہی آسٹریلیا سے آیا ہے۔ جب مَیں نے کریٹ کھول کر اُوپر سے رُوئی ہٹائی تھی تو وہ اِسی پیٹ کی طرح ٹِکا ہُوا تھا اور اُس کا صِرف اُوپر والا مدوّر حِصّہ ہی نظر آ رہا تھا۔

اِمُو کا انڈہ! یہ مَیں کیسی شاعری کرنے لگا ہوں؟ اور شاعری بھی کیا اُدھوری چیز ہے۔ اِمُو کا انڈہ کہنے سے اِس پیٹ کے حُسن کا خاک اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ تو حُسن کو بے جان بنانے والی بات ہے۔ اِمُو کے انڈے کو دیکھ کر اُس گداز لمس کا قطعی احساس نہیں ہوتا جو اس پیٹ کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ میری رُوح تک اِس گُداز لمس کی شبنمی ٹھنڈک سے سرشار ہوتی جا رہی ہے۔ میرے رُخسار کو ایک عجیب سکون بخش ملائمت کا احساس ہونے لگا ہے۔ جیسے چلچلاتے زخم پر ٹھنڈی ٹھنڈی مرہم لگا دی جائے۔ جیسے پیاس سے اینٹھتی ہوئی زبان پر آئس کریم... لاحول ولا قوۃ! یہ کیا تصیدہ گوئی ہونے لگی ہے۔

لیکن یہ کیا بیتابی میرے دل میں اُٹھنے لگی ہے۔ اُف کیا شِدّت کی پیاس ہے...

"بہت دیر لگا دی آج تو..."

"دیر؟ ہاں - ہاں لگادی ہے!"

[تم کیوں اس عورت کو لے کر یہاں کھڑی
ہو جاتی ہو؟ یہ کیا تُک ہے آخر!]

بیوی کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا ہے - ماتھے پر شکن - چہرے کے سارے خطوط تن گئے ہیں
(میرا دِل ڈوبنے لگا ہے) شکن غائب ہو گئی ہے - چہرے کے خطوط ڈھیلے پڑ گئے ہیں - رُخساروں کی
سُرخی ہونٹوں میں سمٹ کر تبسّم بن کے کھِل اُٹھی ہے

"لڑ کر آ رہے ہو کسی سے ؟"

"اوہ! معاف کرنا بھئی

[اب کیا کہوں خواہ مخواہ بیچاری کا دِل دُکھا
دیا - مگر کس قدر تحمّل ہے اس میں

"جائیے - معاف کیا"

"شکریہ ——— ! [کس قدر پیاری مُسکراہٹ ہے]

——— دراصل یہ اسکوٹر بگڑ گیا تھا بہت تنگ کیا اِس نے"

[جھوٹ بولے بنا چارہ نہیں]

لیکن یہ کمبخت پڑوسن کیوں مُسکرا رہی ہے - لو ——— یہ
مُسکراہٹ اس کا پُوپلا پیکو بن گئی ہے - کریپ کی قمیص کے نیچے اِمُو کا انڈہ
بَل کھانے لگا ہے - جیسے کڑاھی میں دُودھ گڑھنے لگے -

یا ابوجہل ——— ! اب کیا ساری رسوئی اُٹھا لاؤ گے بی بی کی -

"اچھا بھئی - اندر تو چلو!" (اس کمبخت پڑوسن سے تو پیچھا چھوٹے)

"نہیں - اندر جانے کا وقت نہیں"

"کیوں ؟"

"آپ کی مہمانی آ رہی ہیں - اور گاڑی کا وقت ہونے والا ہے"

"کون ممانی ؟"

بیوی نے تار نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے ——— راج ممانی آرہی ہیں۔ میں کلائی کی گھڑی دیکھتا ہوں۔ گاڑی آنے میں صرف بائیس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں اسکوٹر کو کِک لگاتا ہوں۔ اسکوٹر غرّا اٹھتا ہے۔ بیوی میرا بازو پکڑ لیتی ہے۔

"کیوں ؟"

[یہ پڑوسن کیوں ہنسے جارہی ہے]

"ممانی کو تو خیر پیچھے بٹھا لو گے۔ مگر سامان کہاں رکھو گے ؟"

"اوہ ——— !" (حد ہے حماقت کی!)

"لو۔ وہ ٹیکسی آرہی ہے۔ خالی ہے۔ روکو !"

بیوی نے خود ہی ٹیکسی رکوالی ہے۔ میں اسکوٹر اندر دھکیلنے لگتا ہوں تو بیوی روک دیتی ہے کہ وہ خود ہی اسکوٹر اندر لے جائے گی اور مجھے اب چل دینا چاہیئے۔ میں وہیں اسکوٹر کو اسٹینڈ پر لگا دیتا ہوں اور ٹیکسی کی طرف بڑھتا ہوں بیوی میرے ساتھ ساتھ آرہی ہے میں ٹیکسی میں بیٹھتا ہوں تو وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے (یہ میں جانتا ہوں) مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میرے اِردگرد ایک مُسکراہٹ کا دُھواں چھا رہا ہے۔ اور سب اور سبھی آوازیں اس میں جذب ہوتی جارہی ہیں۔ میں کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا ہوں۔ بیوی کو وِیو کرتا ہوں۔ پڑوسن پھاٹک کے سہارے کھڑی مُسکرا رہی ہے۔

زمین میرے نیچے سے پھسلتی جارہی ہے ... گھر ... اس کا پھاٹک ... میری بیوی ... پڑوسن ——— سب پیچھے رہ گئے ہیں۔ لیکن وہ مُسکراہٹ۔ وہ برابر میرا پیچھا کر رہی ہے۔

یہ لو ——— یہ ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح میرے سامنے آن ایستادہ ہوئی ہے اور ... اور ... ایک پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ یہ پیکر۔ وہی پیکر۔ وہی وجود۔ اس کا ایک ایک عضو کس قدر واضح، کس قدر نمایاں کس قدر مانوس ... ایک ایک خط ایک ایک خال ——— ہاؤ ——— ! یہ کیا؟ اس کی تو آنکھیں ہی نہیں ہیں۔ سارا وجود شدّت سے نمایاں

ہے مگر آنکھوں کا وجود ہی نہیں ہے... یہ میری نظر اس کے تمام تو سراپا کو ٹٹولنے لگتی ہے۔ تعجب ہے اس پیکر کا وجود تو ہے مگر جسم نہیں ——— مجھے جسم نظر نہیں آتا۔ میرے خدا! وہ پیٹ۔ وہ حسین پیٹ بھر سارے وجود میں سب سے نمایاں ہو گیا ہے۔ اور میرا سر میرے کندھوں پر سے اڑنے لگا ہے اور بائیں رخسار کے بل اس پیٹ سے جا لگا ہے۔ اور وہ ملائم، گداز۔ گرم لمس ——— دھڑکتا ہوا احساس ——— لیکن یہ کیا احساس ہے؟ اس پیٹ کا کوئی رنگ نہیں۔ صرف قمیض کا رنگ ہے۔ کریپ کا کریم رنگ۔

خوب! تو تم اس پیٹ کو عریاں دیکھنا چاہتے ہو؟ یہ کیا بڑھبس ہے میاں! تمہیں شرم آنی چاہیے۔ یہ پڑوسن جسے تم بار بار عورت کے نام سے یاد کر رہے ہو۔ تمہاری لڑکیوں کے برابر ہے۔ تمہاری لڑکی سے ایک دو سال بڑی ہوگی۔ کیا ہوا اگر وہ ایک بچے کی ماں ہے۔ تمہاری بیٹی اگر ڈاکٹری کی تعلیم کی طرف مائل نہ ہوتی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کی بھی شادی ہو گئی ہوتی تو وہ بھی آج ایک دو بچوں کی ماں ہوتی۔

نہیں۔ نہیں۔ میں اس کو نہیں دیکھوں گا۔ میں اس کو بھگا دوں گا ذہن سے۔ میں اسٹیشن جا رہا ہوں۔ میری ممانی آ رہی ہیں۔ ممانی۔ ممانی... راج ممانی...

ایک بچہ... اس کے گرد فراموش گاری کی دھند لپٹ رہی ہے۔ ایک گھر جس کا کرنٹ فیوز ہو گیا ہے۔ تاریکی میں ڈوبی ایک سگریٹ کی چنگاری دہک رہی ہے ——— در و دیوار کا کچھ احساس سا ابھرتا ہے۔ ننھے ننھے روزن کھلتے ہیں۔ کچھ اشکال نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک ماں ہے (مجھے علم ہے ——— شاید بچے کو بھی) مگر اس کا وجود کھو چکا ہے۔ عرصہ ہوا لاحاصل ہو چکا ہے۔ کبھی یہ حاصل تھا یا انتہائی شدت سے غالباً مو حدانہ شدت سے (تب بچے کو علم نہیں تھا ——— احساس تھا۔ جب سے یہ لاحاصل ہوا ہے، اسے محض علم ہے) لیکن ایک دن ایک دم اس ماں کا وجود لاحاصل ہو گیا... بے معنی...

... بچہ، ایک دن چند عجیب الاشکال چیزوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ دیکھ کر چھو کر۔ چکھ کر جاننے کی کوشش کر رہا تھا (بعد ازاں اُسے پتہ چلا اور بہت بعد ازاں جا کر وہ بتانے کے قابل ہُوا کہ یہ کھلونے تھے ——— ایک بندر۔ ایک ریچھ۔ ایک بطخ۔ ایک گھوڑا اور ایک گیند) ان سب کی الگ الگ شکلیں تھیں جنھیں پہچاننے اور یاد رکھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا۔ ہر ایک کا الگ الگ رنگ تھا۔ الگ الگ روپ تھا۔ اچانک وہ بطخ جسے وہ تھامے ہوا تھا اور اس کی گردن کو منہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر دُور جا پڑی وہ اُس کے پیچھے ہمکا۔ وہ اسے دوبارہ پکڑنے کو ہی تھا کہ گیند اُس کے رستے میں حائل ہو گئی۔ ایک دم وہ بطخ سے اُکتا گیا۔ گیند کو دیکھتے ہی اُس کی انگلیوں میں۔ ننھی ننھی ہتھیلیوں میں نرم نرم گدگدی مچلنے لگی اور اُس نے جھٹ گیند دونوں ہاتھوں میں تھام لی اور اپنی انگلیاں گیند میں گڑانے لگا۔ اس کی گدراہٹ مٹھیوں میں بھرنے لگا۔ یہ نرم تھی مگر اس کا گداز کہاں گیا؟ اس کی گرمی کہاں گئی؟

اُسے اپنے پیٹ میں بائیں طرف ایک اینٹھن، ایک کسک سی محسوس ہونے لگی۔ اُس کے من میں ایک گیند بس رہی تھی جو اس بری طرح گول نہ تھی جو نرم تھی گداز تھی اور گرم تھی جس کے لیے آنکھیں نہیں ہونٹ مچلتے تھے جس پر بطخ کی چونچ ایسی چیز تھی جسے منہ میں ڈالتے ہی اس میں سے ایسی سیال چیز جھرنے لگتی تھی جیسی گیلی گیلی شے اپنے دہن میں بھی اتی تھی مگر اس سے کہیں زیادہ لذّت آفریں (اب تو مجھے معلوم ہے اسے دودھ کہتے ہیں) اور پیٹ کی کسک کو یہ کس طرح شانت کر دیتی تھی ...

کسک نے ایک اور انگڑائی اُس کے پیٹ میں لی۔ اُس کے ہونٹ مچل اُٹھے۔ دونوں گیندوں کا فرق مٹ گیا۔ اُس نے گیند منہ میں ڈال لی۔ اور بطخ کی چونچ تلاش کرنے لگا۔ چونچ اُسے نہ ملی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا۔ پھیکا پھیکا۔ بے جان سا ذایقہ اُس کی زبان پر گھلنے لگا۔ اُس نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ یہ وہ گیند نہ تھی۔ اس کے تیز رنگ اُس کی آنکھوں میں کھب رہے تھے۔ اُس نے گیند پھینک دی۔

کسک ایک ٹیس بن کر اس کے پیٹ میں مچلی۔ دل پر جیسے کسی نے چٹکی بھر لی۔ ایک غبار سا سینے سے اُٹھا اور دماغ اور آنکھوں میں چھا گیا۔ اور بچہ زور زور سے رونے لگا۔

اور پھر وہ شدید طور پر حاصل اور پُر معنی وجود بھاگا آیا (جسے ماں کہتے ہیں۔)

بچہ اُس کی پھرتی پر حیران رہ گیا۔ کافی عرصے کے بعد اُسے یہ پھرتی محسوس ہوئی تھی۔ ایک ثانیہ کے لیے رونا اُس کے حلق میں اٹک گیا۔ مشکوک نظر سے اُس نے ماں کی طرف دیکھا۔ اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ لمبوتری سی سخت اور گرم گرم چیز جس کے منہ پہ بطخ کی چونچ معمول سے زیادہ لمبی گول اور موٹی ہوتی ہے اور جو نرم تو ہوتی ہے مگر گداز نہیں۔ اُس کے مُنہ میں ٹھونسی گئی تو وہ اس کی مدافعت کرے گا۔ وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ اس سے پیٹ کی اینٹھن تو بند ہو جاتی ہے مگر اس کی کسک ایک ہلکی ہلکی سُلگنی بن کر دل میں جا بیٹھتی ہے اور اس میں وہ لُطف۔ وہ ذائقہ بھی نہیں ہوتا جو گیند والی بطخ کی چونچ میں سے نکلنے والے رقیق میں ہوتا ہے۔ (میرا خیال ہے کہ کچھ اسی قسم کے احساسات تھے مگر اب تو مجھے دونوں اقسام کے دُودھ کا ذائقہ بھول چکا ہے)

لیکن بچّے نے سُکھ کا سانس لیا۔ ماں کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی (اُس کے ہاتھ میں دُودھ کی فیڈر بوتل نہ تھی)

یکلخت اُسے احساس ہوا کہ وہ رونا بھول گیا ہے اور اگر وہ اسی طرح خاموش رہا تو عین ممکن ہے کہ ماں واپس چلی جائے اور . . . اور . . . بچّے نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ماں نے آگے بڑھ کر بچّے کو اُٹھا لیا۔ اُس کے مُنہ سے پچکارنے اور بہلانے کے بول نکل رہے تھے۔ بچّے نے محسوس کیا کہ ان بولوں کے رنگ میں کچھ اجنبیت کا عُنصر ملا ہوا تھا۔ مگر اُس نے اس کی چنداں پروا نہ کی۔ وہ اُس کپڑے کو کھینچنے لگا جس کے نیچے اُسے معلوم تھا کہ وہ پیاری پیاری گیندیں چھُپی رہتی ہیں جو پیٹ کی اینٹھن بھی مٹا دیتی ہیں اور دل کی کسک بھی۔

ماں نے کپڑا اُس کے ننّھے ننّھے ہاتھوں سے چھُڑا لیا۔ وہ مچلنے ہی لگا تھا کہ ماں نے کپڑا اوپر اٹھا لیا۔ وہ اِس پھرتی پہ حیران ہی ہونے والا تھا کہ اس کی نگاہ چھلچھلاتی ہوئی گیندوں پہ پڑی۔ بے صبری سے وہ ان کی طرف لپکا۔ ایک جھلک میں اُسے خیال آیا کہ بطخ کی چونچ اور اس کے اردگرد کے ہالے کا رنگ کچھ بدلا ہوا تھا (میں دیکھ سکتا ہوں: ہلکے سنہرے گلابی کی بجائے یہ سیاہ ہو رہے تھے) لیکن پیٹ کی اینٹھن اور دل کی کسک نے اُسے بیتاب کر دیا تھا اور اس نے جھٹ بطخ کی چونچ ہونٹوں میں دبائی۔

یہ کیا ——— ؟ ایک بے حد تلخ کڑواہٹ اُس کے مُنہ میں گھلنے لگی۔ جان بخش سیّال کی بجائے ایک جان لیوا کڑواہٹ۔ اُس نے مُنہ گیند پر سے ہٹا لیا۔ زبان کے ساتھ وہ اس کڑواہٹ کو مُنہ سے باہر نکالنے لگا۔ لعاب اُس کے ہونٹوں سے نکل کر ٹھوڑی کی طرف بہنے لگا (ابھی تک اُس نے تھوکنا نہیں سیکھا تھا) مگر کڑواہٹ اور تیز ہو گئی۔ اُس نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی اور متحمندی کی چمک۔ ماں نے گیند بچّے کی طرف بڑھائی۔ یہ آج اس قدر سخاوت کیوں؟ اُس نے دیکھا اس کا رنگ کس قدر قابلِ نفرین ہو رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ کڑواہٹ اِسی گیند میں سے ہی اس کے مُنہ میں آئی تھی۔ اُس نے گیند کو ہاتھوں سے پیچھے دھکیل دیا۔ ماں نے اُس کے ساتھ ضرور کوئی شرارت کی تھی۔ ایک دھچکا سا اُس کے دِل کو لگا۔ کڑواہٹ سارے مُنہ میں بھر گئی اور وہ زور زور سے چلّانے لگا۔

ماں نے اُسے گود میں لینے اور بہلانے پھسلانے کی کوشش کی مگر بچہ مچل مچل کر اُس کے قابو سے نکل نکل گیا۔ اس کا رونا تیز ہوتا گیا اور چلّانا بلند تر۔

اور پھر اس منظر میں باپ وارد ہوا (مجھے علم ہے کہ وہ باپ تھا۔ مگر بچّے کو یہ علم اُس وقت نہ تھا) اس کا وجود دوگونہ تھا مگر نہایت غیر متوازن طور پر پُرمعنی۔ یہ وجود بے حد خوفناک تھا اور بہم آفریں۔ کبھی کبھار نرم اور ملائم اور اکثر فیّاض (وہ بہت سی چیزیں دیتا تھا۔ دلچسپ اور مزیدار جن میں کھلونے بھی ہوتے تھے) لیکن اکثر اُس کی آواز میں ناراضگی اور خفگی ہوتی تھی۔ اُس کی آواز سُن کر بچّے کا دل اکثر ماں کے اُس کپڑے کے نیچے چھُپ جانے کو چاہتا جہاں وہ جان بخش گیندیں چھُپی رہتی تھیں۔ وہ ماں سے کچھ پوچھ رہا تھا شاید اُسی کے رونے کے متعلق۔ اس وقت بھی اُس کی آواز میں کرختگی تھی۔

مگر بچہ ماں کی طرف مائل نہ ہوا کیونکہ ماں ایک چالاک ہنسی ہنستے ہوئے اور اس میں سے بھی ایک دبا دبا لطف لیتے ہوئے باپ کو کچھ بتا رہی تھی، کنایتاً۔ جس کا مفہوم بچہ سمجھ نہ پایا تھا۔ مگر باپ کی اتنی بات وہ ضرور سمجھ گیا تھا "پڑا رونے دو۔ تھک کر خود ہی چُپ ہو جائے گا۔"

اور یہ مفہوم ایک کانٹے کی طرح بچّے کے دل میں چُبھ گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

اس وقت ایک اور شخصیت وہاں آئی جس کا وجود ابھی تک محض ضمنی تھا اس نے بچے کو پچکارا بازو اس کی طرف بڑھائے اور ساتھ ہی (بچے نے محسوس کیا) ماں اور باپ کو جھاڑ جھپٹ کی اور ڈانٹ پلائی۔ اور اب جو اس نے پچکارا تو بے سہارا بچہ اسے اپنی پناہ سمجھ کر اس کی گود میں چلا گیا۔ اس کے بعد یہ ضمنی وجود وحدت اختیار کرتا گیا۔

کئی روز تک گیندیں بار بار بچے کی آنکھوں کے سامنے آتی رہیں مگر جھٹ ہی ان کی بطخ کی چونچوں اور ان کے گرد کے بالوں کا سیاہ رنگ اس کی آنکھوں میں چبھنے لگتا۔ زبان پر وہ روح فرسا کڑواہٹ گھلنے لگتی اور وہ جھٹ ان گیندوں کو ذہن میں سے نکال دیتا اور ان کا ورود آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ جوں جوں یہ گیندیں بسرتی گئیں ماں کا وجود بے معنی ولا حاصل ہوتا گیا اور پھر دادی اماں کا وجود سب سے زیادہ پُر معنی ہو گیا۔

بچہ اب دادی اماں کے ہاتھ سے ہی دودھ پیتا۔ اُن ہی کے ہاتھ سے کھانا کھاتا (دادی اماں نے اب اُسے تھوڑا تھوڑا کھلانا بھی شروع کر دیا تھا) اُن ہی کی گود میں کھیلتا اور رات کو سوتا بھی اُن ہی کے ساتھ ——— ماں اور باپ جب کبھی اُسے زبردستی گود میں لے لیتے تو اپنی جسمانی لاچاری کی وجہ سے وہاں ٹکا تو رہتا مگر جوں ہی اُن کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوتی وہ اُن کی گود میں سے نکل بھاگتا۔

یہ تھا ماحول جس میں ممانی کا وجود سب سے پہلے وارد ہوا تھا۔ وارد نہیں۔ پہلے تو یہ محض متعارف ہوا تھا۔ گھر بھر میں اُن کی باتیں ہوتی تھیں۔ باتیں جو منافقانہ تھیں ۔۔ ماموں نے اپنی مرضی اور پسند سے گھر بھر میں کسی کو بتائے بغیر ممانی سے شادی کر لی تھی اس طرح جہاں اُنھوں نے قوم کی مریادا بھنگ کی تھی وہاں بزرگوں کے روایتی حقوق اقتدار کو بھی پامال کیا تھا۔ مگر مزے کی بات یہ کہ بُرا سبھی ممانی کو کہتے تھے۔ سبھی لوگ پریشان تھے کہ ماموں ممانی کو ساتھ لے کر آ رہے تھے۔

بچے نے خیال کیا کہ جب ممانی یہاں آئے گی تو سبھی لوگ دھکے مار مار کر اسے باہر نکال دیں گے لیکن وہ حیران رہ گیا کہ بجائے باہر نکالنے کے سبھی لوگ اس کا سواگت کر رہے تھے (ممانی نے اُسے گود میں لینا چاہا تو وہ کترا کر نکل گیا) سبھی لوگ چور نظروں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر ماموں اور ممانی کی خاطر داری کرتے

جاتے۔ اُن کی تعریفیں کرتے صدقے اُتارتے اور بلائیں لیتے۔

اب جو ممانی نے بُلایا تو بچّہ اُس کی گود میں چلا گیا اُسے بے ضرر سمجھتے ہوئے اُسی قسم کے احساس اور رویّے کے ساتھ جس قسم کے احساس اور رویّے کے ساتھ سبھی لوگ اُن کی خاطر داری کر رہے تھے۔

اور پھر ماموں اور ممانی ساتھ والے مکان میں رہنے لگے۔ جس کا آنگن اس گھر کے ساتھ مشترک تھا۔ اس وقت تک ممانی کا وجود تو بن چکا تھا مگر غیر متعلق سا۔

پھر یہ وجود متعلق کب ہوا تھا؟ ہوا تو ضرور تھا۔ دُھند پھر چھانے لگی ہے۔ اور پھر ایک دم جیسے دھوپ نکل آئی۔ ہر چیز پوری طرح نمایاں ہو گئی:

ایک اسپیشل ٹرین ہندوستان بھر کے تیرتھ استھانوں کی یاترا کو جا رہی تھی۔ دادی آماں کا ارادہ بھی اس میں جانے کا بن گیا بچّہ نے ضد کی کہ وہ بھی ساتھ جائے گا۔ اُسے ٹالنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اڑ گیا کہ وہ بھی ساتھ جائے گا ورنہ دادی آماں کو بھی نہیں جانے دے گا۔ اور پھر سب رضامند ہو گئے کہ ہاں وہ بھی دادی آماں کے ساتھ جائے گا۔ بچّہ بے حد خوش تھا... بے حد پُرجوش... بے حد خوابناک...

گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ ایک برتھ پر دادی آماں کا بستر بچھ رہا تھا۔ دادی آماں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں بچّہ اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ خوشی سے چہک رہا تھا۔ ماں اور باپ دونوں پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑکی میں سے جھانک کر دادی آماں سے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کرنے لگتے کہ اُن کے کنائے بچّے کی سمجھ میں نہ آتے۔ باپ نے ایک دو مرتبہ اُسے باہر آنے کے لیے کہا تھا مگر وہ احتیاطاً ہی باہر نہ گیا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی اور گاڑی چلنے میں ہی نہ آ رہی تھی۔ اُس نے کئی بار آماں سے پوچھا تھا دادی آماں سے پوچھا تھا۔ ہر بار اُنھوں نے جواب دیا تھا کہ جب ساری سواریاں آ جائیں گی تب چلے گی۔

بچّہ کھڑکی کے باہر بھیڑ کا تماشا دیکھنے لگا۔ وہ بیشتر ازاں بھی گاڑی کا سفر

ایک دو بار کر چکا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ ماں اور باپ قدرے فکرمند ہو رہے تھے۔ مگر سفر کے EXCITEMENT میں اُس نے زیادہ خیال نہ کیا، اور پھر پتا جی اُس کے ساتھ بہت سی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ آج وہ بے حد مہربان نظر آ رہے تھے۔ جب بھی کبھی وہ اس طرح مہربان ہوتے تھے تو بچّے کو بہت بھلے لگتے تھے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ کئی طرح کی چیزیں دلاتے تھے۔ کھڑکی کے سامنے ایک ریڑھی والا کھڑا ہوا۔ ریڑھی میں بہت سے کھلونے تھے۔ ایک کوک والے کھلونے نے بچّہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ ایک جھولا تھا جس میں ایک بازیگر جھولا جھولتے ہوئے قلابازیاں لگا رہا تھا۔ بچّے کا جی للچانے لگا۔

"ننھے! کھلونے لو گے؟" باپ نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو آؤ۔ لے دیں۔"

اور بچّہ بڑھے ہوئے بازوؤں میں چلا گیا۔ باپو اُسے ریڑھی کے قریب لے گئے اور اُسے کھلونے پسند کرنے کے لیے کہا۔ بازیگر اُس نے پسند کر لیا۔ باپو نے دلا دیا۔

اسی وقت ریل گاڑی نے ایک دم چیخ ماری۔ بچّہ چونک اُٹھا اور گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ گاڑی کھڑی تھی۔ باپ نے اُس کی توجہ کھلونوں کی طرف لگا دی۔

گاڑی نے پھر چیخ ماری۔ بچّے نے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی چلنے لگی۔ ایک دھچکا اس کے دل کو لگا۔

"دادی آماں!" وہ بازو پھیلا کر ہمکا۔ مگر باپ نے اُسے مضبوطی سے تھامے رکھا۔ گاڑی تیز ہو گئی۔

"دادی آماں۔ دادی آماں!" وہ چلّایا۔ گاڑی کے پہیّے جیسے اُس کے دل پر سے گزر رہے تھے۔

دادی آماں نے سر کھڑکی میں سے نکالا۔ باپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ سر

اندر کرلے۔ دادی اماں نے سر اندر کرلیا۔

"بابا ——— اماں!"

(تم لوگوں نے مجھے فریب دیا۔ میرے ساتھ زبردستی کی)

اور بچہ زور زور سے رونے لگا۔ بازو پھیلائے وہ چلانے لگا:

"دادی اماں۔ دادی اماں!"

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی (اب تو کوئی امید باقی نہ رہی تھی) ایک سسکی ——— گہری سسکی بچے کے سینے سے اٹھی ———

(دادی اماں، تم نے بھی میرے ساتھ دھوکا کیا! تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا؟ اچھا، دادی اماں ۰۰ بابا)

سبھی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ زیادتی کرتے ہیں۔ کرتے رہیں۔ لیکن میں نہیں روؤں گا۔ نہیں روؤں گا۔ یہ لوگ جو جی چاہے کریں۔ میں ان کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔ میں کچھ کھاؤں گا نہیں۔ پیوں گا نہیں۔ کسی سے نہیں بولوں گا۔۔۔

اور بچہ خاموش ہوگیا۔

اماں نے اسے کھانا دیا۔ اس نے کھایا نہیں۔ اماں نے اسے دودھ دیا، اس نے پیا نہیں۔ باپ نے اسے کھلونے دیے اس نے چھوئے تک نہیں۔ رات کو اماں نے اسے اپنے ساتھ سلایا۔ اماں سوگئیں تو وہ اٹھ کر زمین پر لیٹ گیا۔ اور وہیں پڑا پڑا سوگیا۔ دوسرے دن بابا نے اسے اپنے ساتھ سلایا تو اس نے پھر ویسے ہی کیا اور باپ نے اسے الگ چارپائی پر سلا دیا تو رات کو اس نے پھر ایسے ہی کیا۔

اماں اسے نہلاتیں وہ چپکے سے نہا لیتا (پہلے کی طرح نہ روتا اور نہ شور مچاتا) اماں اس کی کنگھی کرتیں۔ وہ دم سادھ کر کنگھی کروا لیتا، وہ سرمہ لگاتیں۔ وہ چپ چاپ پڑا رہتا۔ کپڑے بدلتیں وہ خاموشی سے کپڑے بدلوا لیتا۔ اور پھر چپ چپ کسی کونے میں بیٹھا بے معنی نظروں سے ہر ایک چیز کو گھورتا رہتا۔ اماں اور بابو اسے گود میں لیتے تو وہ منمنا نے

لگتا اور اُن کی گرفت سے نکل کر دور جا بیٹھتا۔۔۔

اسی طرح وہ بیٹھا تھا برآمدے کے زینے پر۔ نہایا دھویا بنا سنورا۔ اور اُس کے قریب ہی پڑا تھا دلیے کا وہ پیالہ جو امّاں نے اُسے دیا تھا مگر اُس نے چھوا تک نہیں تھا۔ اُس کے پیٹ میں جیسے کوئی دانتوں سے کاٹ رہا تھا مگر وہ پیٹ کو کہنیوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

ممانی وہاں آئیں اور امّاں سے ننھے کا حال پوچھا۔ امّاں نے سارا حال بتلایا اور کہا کہ ننھا روٹھا بیٹھا ہے اور کسی طرح نہیں مانتا (اور ننھے کو پتہ چلا کہ یہ سارا اوطیرہ جو اُس نے اپنا رکھا تھا اِسے روٹھنا کہتے ہیں) اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز نہیں منے گا۔

ممانی اُس کے پاس آئیں اور پچکار کر اُسے گود میں لینا چاہا۔ مگر وہ منمنایا اور تلملا کر اُن کے بازوؤں سے نکل گیا۔ ممانی نے گہری نظروں سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر اُس کے پاس بیٹھ کر اُسے پیار کرنے لگیں۔ اُسے بہلاتے ہوئے بولیں۔ یہ امّاں بہت بُری ہیں اور بابا بھی۔ تم میرے بیٹے بن جاؤ۔ ان کے پاس مت رہو۔ آؤ، تم میرے ساتھ چلو! میرے گھر میں۔ اور ننّھے کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا۔

ممانی نے اُسے گود میں اُٹھالیا۔ اب کہ وہ چُپ چاپ اُن کے پاس چلا گیا۔ ممانی اُسے اپنے گھر لے گئیں۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر اُنھوں نے ننھے کو اپنے زانوؤں میں دبالیا۔ اُس کے آنسو پونچھے بہلایا۔ چُپ کرایا اور بڑے دُلار کے ساتھ ایک ننھے سے چمچے کے ساتھ اُسے فیرنی کھلائی پھر اُسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرنے لگیں۔ ممانی نے اُسے لوریاں سُنائیں۔ ننھے کی

"گھوڑیاں" گائیں اور ننھا ہچکیاں لیتا اُن کے زانوؤں میں دبا اُن کے سینے سے لگ کر سوگیا۔ نیم خوابیدہ حالت میں وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا سر . . .

ٹیکسی رک گئی ہے۔ ڈرائیور دروازہ کھولے مودب کھڑا ہے کہ میں باہر نکلوں گاڑی پہنچ چکی ہے۔ اور مسافروں کی بھیڑ اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں سے برآمد ہو رہی ہے۔ اندر جانا اب فضول تھا۔ میں ڈیوڑھی میں ہی ممانی کی تلاش کرنے لگتا ہوں اچانک کوئی میرا بازو تھام لیتا ہے۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں، یہ ممانی ہیں۔ میں اُن کے پانو کی طرف جھکتا ہوں۔ وہ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر جھٹ سے مجھے سیدھا کر لیتی ہیں۔ اور پھر سینے سے لگا لیتی ہیں۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ ممانی مجھ سے سب کی خیر خیریت پوچھ رہی ہیں۔ ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ [ٹیکسی بڑے آرام سے چلی جا رہی ہے]

گھر کے پھاٹک پر وہ کھڑی ھے —— میری بیوی اور . . . اور وھی . . . وھی پڑوسن۔ لفٹ ایک دم پانچویں منزل سے نیچے اُترنے لگتی ھے۔ اُف، میرے خدا! مجھے کیا ھوتا جا رھا ھے۔ مجھے بیوی کو صاف صاف کہہ دینا پڑے گا کہ وہ اِس طرح پڑوسن کو ساتھ لے کر پھاٹک پر کھڑی نہ ھوا کرے۔

ٹیکسی رک گئی ہے۔ ممانی اور میں باہر نکلتے ہیں۔ ملازم سامان اندر لے جا رہے

ہیں۔ ممانی میری بیوی سے گلے لگ کر ملتی ہیں۔ میری بیوی ممانی اور پڑوسن کا تعارف ایک دوسری سے کراتی ہے۔ میں غور سے دونوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے دیکھتا ہوں۔ میرا اُوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے۔

اُف، میرے خدا! پڑوسن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی جگہ اگر ممانی کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں لگا دی جائیں تو وہ بالکل ویسی ھی لگنے لگے جیسی ممانی اُن دنوں لگتی تھیں جب انھوں نے مجھے — ایک ننھے بچے کو اپنے زانوؤں میں دبا کر اور سر کو اپنے پیٹ کے ساتھ بھینچ کر روتے بسورتے کو چپ کرایا تھا......

اقبال متین

وہ لکڑی سے بنا آدمی تو نہیں تھا۔ لیکن اُس نے اپنے دو سوکھے ڈنٹھل جیسے ہاتھ سیدھا ہو کر اپنی گود میں رکھ لیے جن کے سہارے وہ پیچھے کی طرف جھکا ہوا نیم دراز تھا۔ اُس کا تہمد رانوں تک اٹھا ہوا تھا۔ اور رانیں ایسی لکڑی سے بنائی گئی تھیں جسے چھیل چھال کر درست بھی نہیں کیا گیا تھا ——— وہ اپنے جسم کی بدہیئتی چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا اس کے باوجود اس نے اپنا تہمد اپنی رانوں پر برابر کر لیا اور کانچ کی آنکھوں کو ڈھانکتے ہوئے پلاسٹک کے پپوٹے حرکت میں آئے۔

پھر ان کانچ کی آنکھوں نے مجھے دیکھنے کی کوشش کی ——— اور دیکھا بھی۔

یہ وہی آدمی تھا جسے میں کئی برس سے صرف صورت شناسی کی حد تک جانتا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کس کا کون ہے۔ مہینوں برسوں اُس سے ملاقات نہ ہوتی۔ اُس کے بارے میں

لکڑی کا آدمی

جو کچھ سن رکھا تھا وہ اس کو ناپسند کرنے کے لیے بہت تھا۔ لیکن دو سال قبل جب ایک شراب خانے میں اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ تنہا بیٹھا پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کو اچنبھا ہوا ——— اسے دیکھ کر مجھے کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کسی مسجد کا آدمی تھا یا میں کسی خانقاہ کا ——— ہم ملے اُسی مقام پر تھے جہاں ہم مل سکتے تھے۔ صرف بات اتنی تھی کہ یہ بار، میرے روزمرہ کے راستوں سے بالکل الگ تھا اور میرے گھر سے بہت دور۔ اس کا مکان البتہ اس بار سے بہت قریب تھا سو اس کا یہاں چلے آنا سمجھ میں آتا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اصرار کرنے لگا کہ میں اُسی کے ٹیبل پر آجاؤں۔ اس زمانے میں وہ بالکل گوشت پوست کا انسان تھا۔ لکڑی کا آدمی نہیں۔ جن دنوں وہ گوشت پوست کا تھا اُن دنوں لوگوں نے اُڑا رکھی تھی کہ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے اور جب وہ لکڑی کا بن گیا تو لوگوں نے کہا کہ اُس کے سینے میں بھی دل ہے اور یہ سب کچھ کہنے والے بھی کون

تھے۔ کوئی غیر نہ تھے۔ سب کے سب اس کے اپنے ہی تھے۔

جب ہم بار سے اٹھ کر باہر آ گئے تھے تو کچھ دور چلنے کے بعد وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ پاٹی جا سکتی ہے اور اگر نہیں پاٹی جاتی تب بھی نہ اس کی زندگی میں کوئی فرق پڑتا نہ میری۔ اس کے باوجود اس کے دل میں مجھ سے قربت کی خواہش کیوں تھی وہ کیوں یہ چاہتا تھا کہ میرے ذہن سے اس کا اپنا غلط امیج اور مسخ چہرہ ہٹا کر صحیح خد و خال اجاگر کرے۔ بار کے ٹیبل پر جب اس نے چبا چبا کر لفظ اس طرح ادا کیے تھے جیسے جذبات کا جگال کر رہا ہو تو مجھے اس کے کرب کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ نام لیے بغیر جس شخص کا تذکرہ وہ کرتا رہا ہے وہ میرا قریبی رشتہ دار ہے جس سے ہمارے گھرانے کی ان بن ہے اور اس ان بن کا علم اس کو نہیں ہے۔ اسی شخص نے اس کے گھر کا سکھ چین چھین کر مقفل کر دیا ہے۔ اس کو اپنے گھر کے کھلے ہوئے دروازے آہنی سلاخوں کی طرح لگنے تھے۔ اس کو اپنے گھر کی چھت کے نیچے بند کمروں تک میں جھلسنے والی دھوپ ملتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑے ہو کر جب وہ خالی خالی آنکھوں سے ٹیبل پر دھری صاف ستھری پلیٹوں کو دیکھتا تو اس کا جی چاہتا کہ پلیٹیں فرش پر بکھرا کر کرسیاں ٹیبل پر اوندھا دے —— وہ ڈائننگ روم سے نکل کر تیز تیز چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں چلا آتا —— کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر تازہ ہوا کے فراٹے اپنے نتھنوں سے پی جانا چاہتا —— پھر سیلنگ فین کھول دیتا اور کچھ اس طرح اپنا بدن پنکھے کے نیچے رکھ دیتا جیسے لکڑی کے اسٹیچو کی گرد ہوا سے جھاڑ رہا ہو۔ پھر یکایک وہ بڈروم کا رخ کرتا۔ پلنگ پر بچھی بڈ شیٹ کی شکنوں کو بغور دیکھتا یا بظاہر یوں لگتا کہ وہ ان شکنوں کو ان سلوٹوں کو بغور دیکھ رہا ہے۔ اگر کوئی اس وقت اس کی آنکھوں میں جھانک سکتا تو یقیناً وہ آنکھیں کانچ کی دکھائی پڑتیں جن پر پلاسٹک کے پپوٹے ہوتے۔ لیکن اپنے ڈنٹھل جیسے سوکھے ہاتھ بڑھا کر وہ چادر کی شکنیں صاف کر دیتا اور لمبی لمبی سانس لیتا جیسے اپنی خوبصورت بیوی کے بدن کے لمس کو سونگھ کر محسوس کر رہا ہو۔ پھر وہ کچھ سوچ کر پلنگ پر بیٹھ جاتا —— جب وہ سوچ رہا ہوتا اس وقت لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں زندگی کے آثار نظر آتے پھر دیکھتے کے دیکھتے اس کی آنکھیں کانچ کی ہو جاتیں اور دماغ سوچ سے عاری لگتا۔ سوکھے ٹنڈ اس کو سہارا دینے کے لیے پیچھے کی طرف خود بخود چلے جاتے اور وہ اپنا دھڑ ان پہ ٹکا کر کچھ دیر

بیٹھا بیٹھا اونگھ جاتا۔ رات کی نیم خوابیدہ آنکھیں پھر اصلی ہو جاتیں شیشے کی نہ رہتیں۔ ان کی سُرخی صاف نمایاں ہوتی اور لگتا کہ وہ رات بھر نہ سو سکنے کے بعد نیند کو منا رہا ہے اور جب نیند اس کی آنکھوں کی ویرانی میں بھٹکنے لگتی تو وہ اونگھ جاتا۔ اور اونگھتے اونگھتے جب چونک کر بیدار ہوتا تو کانچ کی آنکھوں میں زندگی کے آثار نمایاں ہوتے۔

پیٹ کی تکلیف برداشت کرتے کرتے وہ نڈھال ہو گیا تھا —— آہستہ آہستہ اس کے اعضا جواب دے رہے تھے۔ جسم کا گوشت جو اس کی وجاہت اور بردباری کا ضامن تھا پتہ نہیں کس طرح اور کہاں غائب ہو رہا تھا۔ گھر میں اس کی اہمیت کم ہو رہی تھی۔ وہ اپنی تہمد ٹھیک کر کے کبھی ڈرائنگ روم کے کسی گوشے میں صوفے پہ اکڑوں بیٹھ جاتا تو پیٹ کے درد کی ہلکی ہلکی لہریں ذرا تھم جاتیں اور وہ سوچنے لگتا کہ محبت اس کے لیے ایک ایسا لفظ ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ بھری جوانی میں جب وہ اپنی خوبصورت دلہن کو لے آیا تھا تو صبح ہوتے ہوتے ایک احساس اس کے دل و دماغ میں رچ بس کر اس کی زندگی کا حاصل بن گیا اور وہ یہی تھا محبت مفقود ہے۔ وہ کہاں ملتی ہے۔ کس قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہے۔ دام چکائے جائیں۔ اپنے آپ کو قربان کر دیا جائے تب بھی محبت نہیں ملتی۔ پھر بھی اس نے بہت کوشش کی کہ محبت کا بیج بو کر اس کا پھلتا پھولتا پودا اپنے گھر میں دیکھے لیکن آبیاری کرتے کرتے جب وہ تھک گیا تو اس نے دیکھا کہ محبت کا کومل پودا ہزار جتن کے باوجود مرجھا رہا ہے لیکن اس کے برابر ہی ایک درخت جو تیزی سے پھل پھول رہا ہے وہ بھی دلکش ہے۔ محبت کے مرجھائے ہوئے پودے کے بالکل پاس ہی عزت و توقیر کا تناور درخت کھڑا تھا۔ پھر اس درخت کے سائے گھنے ہوتے گئے۔

اس کی تنخواہ معقول تھی۔ ذاتی گھر تھا۔ وہ اپنے متعلقین پہ دل کھول کر خرچ بھی کرتا تھا۔ اس نے اپنے گھر کو زندگی کی ساری ضروریات سے مکمّل کر رکھا تھا۔ سجاوٹ اور آرائش میں بھی کوئی ایسی کمی نہ تھی —— بیوی اچھا کھاتی اچھا پہنتی۔ پھر بچے ہوئے تو اچھا پہن اوڑھ کر اچھے اسکولوں میں داخل ہوئے۔ خاندان بھر میں اس طرح اُس کی توقیر بڑھتی ہی گئی۔ اُس کی بیوی کے رشتے دار جب بھی دُور دراز سے شہر آتے اُسی کے گھر آ براجتے۔ اس کی بیوی سب کی خاطر مدارات میں لگی رہتی —— اپنی بیوی کی دمکتی چھب، خوشی دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو جاتا۔ لیکن اس کے روزمرہ میں کوئی فرق نہ

آیا۔ شام کو تھکا ہارا گھر لوٹ کر وہ دیر تک نہاتا رہتا ——— پھر اپنے گھٹنے پاؤں کا پانی خشک کرتا ہوا تولیہ ہاتھ میں لیے ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ جاتا۔ اب اس کی خواہش ہوتی کہ اس کی بیوی سب کو چھوڑ کر اس کی طرف توجّہ کرے لیکن ایسا اُس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک وہ کسی نہ کسی چھوٹی سی بات پر گھر کے کسی فرد سے ناراضگی اور خفگی کا اظہار نہ کرے۔ جب اس کی بیوی کی توجہ اس کی طرف نہ ہوتی تو وہ اپنا لہجہ بدل کر مُنّی سے مخاطب ہوتا:

"کیوں مُنّی تم نے اب تک منہ ہاتھ نہیں دھویا، کپڑے نہیں تبدیل کیے۔"

یا گھر کے کسی نوکر پر اُس کی ڈانٹ پڑتی:

"کیوں آنگن میں اب تک جھاڑو نہیں لگائی گئی۔ آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے۔"

گھر کی بڑی بوڑھیاں بھانپ جاتیں کہ اس کا موڈ خراب ہو رہا ہے۔ اس کی ساس اپنی بیٹی کو ایسی آواز میں نصیحت کرتی کہ وہ بھی سُن سکے:

"صاحب میاں کو چائے جلدی دو بیٹیا۔ تھکے ہارے آئے ہیں دفتر سے، تب ہی تو اس کروفر سے یہ گھر بار چلتا ہے۔"

اُس کی بیوی بھی سمجھ جاتی کہ میاں صاحب کے ہر جملہ لفظ "کیوں" سے شروع ہو رہا ہے تو ان کی طرف فوری توجّہ ضروری ہے۔

دیکھتے کے دیکھتے کشتی میں سجی چائے۔ اسنیکس اور پنیر کے ٹکڑے میز پر دھرے ہوتے۔ ملازمہ ڈری مری رکھ جاتی۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھیں بیوی کا طواف کرتی رہتیں۔ اس کی خواہش ہوتی کہ وہ خود لے آتی چائے ——— اپنے ہاتھ سے بناتی اور اس کے مقابل بیٹھ کر اس سے محبّت کی باتیں کرتی۔ اس سے کہتی، اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ اپنے بال تو خشک کیجیے ——— اتنا تھک جاتے ہیں، ذرا کی ذرا سستا لیجیے اور پھر یہ روز کا روز باہر جانا کیا ضروری ہے۔ وہاں کوئی آپ پر کنٹرول بھی تو نہیں کر سکتا۔ یہیں گھر میں بھی تو پی جا سکتی ہے۔ میں سامنے رہوں گی تو آپ زیادہ نہ کر سکیں گے کچھ۔ جوانی ہے۔ طاقت ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے آپ کے پاس، پھر کیوں آپ اپنی صحت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔

وہ پنیر کا ٹکڑا منہ میں گھولتا ہوا چائے کا گھونٹ لیتا رہتا اور اس کا ذہن اپنی بیوی کو پاس بٹھلا کر اس سے محبّت کی باتیں کرتا رہتا۔ لیکن اس کی نگاہیں اس کی اپنی بیوی

کا طواف کرتی رہتیں۔ جو بے نیازی سی گھر کے کاموں میں جٹی رہتی۔ اگر کبھی ایسا ہو جاتا کہ اس کی بیوی خود چائے لے کر چلی آتی تو وہ اپنے لہجے میں دُنیا بھر کی گھلاوٹ پیدا کر کے اس کو اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہتا۔ لیکن وہ گھر کی مصروفیات کا بہانہ کر کے ٹال جاتی۔ ایسے میں کبھی اس نے تحکمانہ انداز سے کہا بھی تو بیوی نے احتجاج نہیں کیا۔ خاموشی سے آکر اس کے مقابل بیٹھ گئی اور ہوں ہوں کرتی اُس کی باتوں میں ——— اِس طرح شامل ہوئی جیسے اونچا سُنائی دیتا ہو۔

بچے کچھ دُور دُور ڈرے ڈرے پھٹے پھٹے سے پھرتے۔ نوکر سامنے سے گزرتے وقت اکثر اپنی چال بھول جاتے۔ ننھے کی آیا کے چہرے سے وہ ہنسی غائب ہو جاتی جس کے بغیر اس کے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیا ملازم برتن صاف کرتے اور جھاڑو لگاتے وقت آیا کو تکتے رہنا بھول جاتا ——— عزت، توقیر، احترام ہر شے جیسے اپنے ٹھکانے پر دھری رہتی اور اس کا جی چاہتا کہ گھر کی ساری چیزوں کو تہس نہس کرتا پھرے اور پکار پکار کر سب سے کہے دیکھو نا میں بھی تو گوشت پوست کا انسان ہوں۔ چاقو سے میرا بدن زخمی کر دو تو میں بلک سکتا ہوں، اور میرے بدن سے خون بھی رِس سکتا ہے ——— مجھ سے نفرت کرو۔ میں غصہ کر سکتا ہوں۔ مجھے چاہو۔ مجھے پیار کرو۔ میں موم بن کر پگھل سکتا ہوں ——— مجھے اتنی عزت نہ دو۔ میرا اتنا احترام نہ کرو۔ میں پتھر کا دیوتا نہیں رہنا چاہتا ——— مجھ سے میرے آدمی ہونے کا حق نہ چھینو۔ دیکھو نا ——— دیکھو نا۔ مجھے رونا آتا ہے۔ مجھے ہنسنا آتا ہے۔ اور وہ گمبھیر گمبھیر سا چائے کا آخری گھونٹ لے کر پنیر کے ٹکڑے پلیٹ میں بھول جاتا اور ٹیبل سے اُٹھ کر آئینے کے سامنے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنے لگتا۔ اس کو اپنے بیڈ رُوم کے آئینے کے سارے عکس یاد آنے لگتے۔ اپنی خوبصورت بیوی کے بدن کے سارے زاویے سارے خطوط ——— یہ سارے کے سارے عکس آئینے میں جم کر مورتیاں بن گئے تھے جن کو وہ جب چاہتا دیکھ سکتا تھا ——— ٹائی کی گرہ ٹھیک ہونے کی بجائے کچھ بگڑ گئی تو اس نے ایک جھٹکے سے گرہ کھول دی اور اس جھنجھلاہٹ کو اپنے اندر جڑ پکڑتا دیکھ کر جھٹلانے کی کوشش کی جس کو غیر شعوری طور پر وہ کئی بار جھٹلا چکا تھا۔ گردن کے اطراف کالر کے نیچے ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے اکثر دفتر جانے سے قبل وہ پچھلی رات کا ذہن میں اعادہ کرنے لگتا۔

یہ ساری باتیں اس وقت کی ہیں جب وہ گوشت پوست کا انسان تھا لیکن

اس کے گھر والے یوں سمجھتے تھے کہ اس کے سینے میں دل کی جگہ کوئی اور شے ہے، کیا معلوم پتھر ہی ہو ——— اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی آئے۔ ایسی تبدیلی جو عارضی ہی سہی مگر کچھ تو ہو ——— وہ پکارے تو کوئی آکر اس سے لپٹ جائے۔ وہ تیز نگاہوں سے کسی کو دیکھے تو گھر کے لوگ اس کی طرف نظر کیے بغیر مسکرائیں اور اس کو رجھا کر منالیں ——— لیکن اس کی بیوی ——— اس کی بیوی کسی شب برہم ہو کر انکار کر دے۔ اور اس کی ایک نہ چلے ——— وہ جب چاہتا ہے اس کو بلا لیتا ہے۔ وہ انکار کر دے تو اس کے لہجے کا تحکّم بیوی کو اپنے حصار میں لے کر کمرے میں دھکیل دیتا ہے۔ پھر وہ اس کو چومتا ہے۔ اس کو بھینچتا ہے۔ اس کے کپڑے اتار دیتا ہے اور صبح ہوتے ہوتے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی پیاس اور بڑھ گئی ہے۔ اس کی بیوی عورت نہیں ہے بیوی بھی نہیں ہے۔ سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی کوئی مورتی ہے اور یہ مورتی وقت پڑنے پر اس کے جسم کی حدّت سے نرم ہو کر ربڑ کی گڑیا بن جاتی ہے۔

ایک وقت جب وہ رات گئے گھر لوٹا تو خلافِ معمول سارا گھر جاگ رہا تھا۔ اس کی بیوی بچے بڑی بوڑھیاں سب ہی نووارد کو گھیرے ہوئے ہنسی مذاق میں خوش خوش تھے۔ وہ گھر کا ماحول دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ آنے والا کون ہے ——— یہ اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ نووارد جب بھی آیا ہے اس کا گھر اسی طرح زعفران زار بن گیا ہے ——— وہ جانتا تھا کہ جونہی اس کی آمد کی خبر سب کو ہو جائے گی قہقہوں کا دم گھُٹ جائے گا۔ سب کے سب گمبھیر اور سنجیدہ ہو جائیں گے۔ اس کی بیوی اُٹھ کر خود ہی اس کا کھانا میز پر چُن دے گی ——— نووارد بڑے تپاک سے اس سے ملے گا اور گھر بھر کے رت جگے نیند کی تلاش میں کونے کونے پھرنے لگیں گے۔

یہ آدمی وہی تھا جس کو اُس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ شادی سے قبل اس کو معلوم ہوا تھا کہ اس کی ہونے والی دُلہن اپنے کسی رشتے کے بھائی میں دلچسپی لیتی ہے، لیکن لڑکی کے ماں باپ کو وہ لڑکا ایک نظر نہیں بھاتا اس لیے کہ وہ بے روزگار ہے۔ نٹ کھٹ اور کھلنڈرا ہے ——— اور جب اس نے اپنی منگیتر کو پہلی بار دیکھا تھا تو اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا تھا:

"نو عمری کی یہ سطحی جذباتیت کچھ دن رہتی ہے اور بس، مجھے رشتہ منظور ہے۔" لیکن

اس کے بعد اس کھلنڈرا بے روزگار لڑکے نے اس کا سکھ چین چھین کر کہیں مقفل کر دیا تھا۔ اس کو اسی کے گھر میں اس طرح قید کر کے رکھ دیا تھا کہ وہ باہر بھی جاتا تو اپنا دل یہیں چھوڑ جاتا جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ پتھر کا ہے ——— لیکن یہ ساری باتیں اس وقت کی تھیں جب کہ پیٹ کے درد کا عارضہ اسے لاحق نہیں ہوا تھا اور وہ گوشت پوست کا آدمی تھا اور اس سے میری صورت شناسی کی حد تک شناسائی تھی۔ اور اس سے مہینوں برسوں میری ملاقات نہ ہوتی تھی۔ اور اس کے ہاتھ سوکھے ڈنٹھل جیسے نہ تھے ——— اور اس وقت تک اس کی رانیں ایسی لکڑی سے نہیں بنائی گئی تھیں جسے چھیل چھال کر درست بھی نہیں کیا گیا تھا ——— اور نہ اس کے پاس کانچ کی آنکھیں تھیں۔ نہ پلاسٹک کے پپوٹے ——— بس ایک ہی چیز اس کے ساتھ تھی اور وہ تھی اس کی عزت وتوقیر۔ اس کا احترام۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ نٹ کھٹ آدمی میرا بھی رشتہ دار ہے۔

بار میں ساتھ ہوا تھا تو وہ اسی کوشش میں لگا رہا تھا کہ اس کا دکھ درد الفاظ کی صورت میں لبوں تک نہ آجائے۔ لیکن جب بھی اس نے زبان کھولی تھی الفاظ کا جگال کرتا ہوا بکھرتا گیا تھا۔ اور بار سے باہر نکل کر جب وہ لڑکھڑانے لگا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا وہ قریبی رشتہ دار جس کا نام لیے بغیر اس نے میرے ذہن کے اطراف دھند بکھیر دی تھی اس کو پکڑ کر زور زور سے ہلا رہا ہے۔ اور وہ نشہ میں جھومتا ہوا ایسا پیڑ لگ رہا ہے جس کی شاخیں تو نہیں ٹوٹ سکتیں ہاں جس کی جڑیں دھرتی چھوڑ سکتی ہیں۔

بار کی اس ملاقات کے دو سال بعد جب میں اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر گیا تھا تو اس کے پیٹ کا آپریشن ہونے والا تھا ——— اور وہ لکڑی کا آدمی بن چکا تھا۔ اس کے آپریشن کی خبر سن کر دور دور سے اس کے اور اس کی بیوی کے رشتہ دار جمع ہو گئے تھے۔ ان ہی سب میں میرا وہ رشتہ دار بھی تھا جس کے بارے میں بات کرتے وقت اس نے بار میں الفاظ کا جگال کیا تھا۔ جس کے آجانے سے گھر زعفران زار بن جاتا تھا اور جس کو اس نے کبھی بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔

جس وقت میں پہنچا ہوں وہ پلنگ پر اپنی ہڈیاں سمیٹے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے سوکھے ڈنٹھل جیسے ہاتھ سیدھے ہو کر اپنی گود میں رکھ لیے۔ اس کا تہمد رانوں تک اٹھا ہوا تھا اور رانیں ایسی لکڑی سے بنائی گئی تھیں جسے چھیل چھال کر درست بھی

نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کے وجود کو میں محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا گھر کے اندرونی حصے سے ہنسنے بولنے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوا سے پردہ سرکا تو میں نے دیکھا کہ اُس شخص کو بچے بڑے سب ہی گھیرے ہوئے تھے جو اس کی بیوی کا بھی رشتہ دار تھا، میرا بھی اور جس کے بارے میں اُس نے بار میں الفاظ کا جنگال کر کے اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کی تھی ——— ادھ جلے سگریٹ کو پھر سے جلا کر اُس نے کش لیا۔ پیٹ کو بائیں جانب سے دبا کر وہ جب تھوکنے کے لیے جھکا تو برتن میں سگریٹ کے ٹوٹوں کا انبار تھا۔ اس نے اپنی شیشے کی آنکھوں سے پلاسٹک کے پوٹے ہٹائے اور جلے ہوئے سگریٹوں کو بغور دیکھنے لگا پھر ایک لمبا کش لے کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بانس کے بدن پر چلتا ہوا اس دروازے تک پہنچا جس سے میں نے ابھی ابھی اندر کا منظر دیکھا تھا۔ وہ پردہ ہٹا کر کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ لیکن اس کے وجود کو وہاں شاید کسی نے محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ تہمد سنبھالتا ہوا بستر تک آ گیا اور پلنگ پر لٹکتے ٹکتے پھر ایستادہ ہو گیا۔ جسم کی لکڑیاں، بانس کے بدن پر جما کر وہ کھڑکی تک پہنچا جو اس کے گھر کے اندرونی حصے میں کھلتی تھی۔ پردہ سرکا کر وہ کچھ اس طرح کھڑا رہا جیسے کسی چیز کی تلاش کر رہا ہو ——— پتہ نہیں اس کو وہ چیز وہاں ملی یا نہیں۔ میں سمجھ گیا، محبت ڈھونڈنے والا اب اپنی عزت و توقیر ڈھونڈ رہا ہے ——— ہو سکتا ہے میں نے صحیح سمجھا ہو ——— جب وہ کنجی بھرے گڈے کی طرح چلتا ہوا پلنگ تک آ گیا تو انگلیوں تک ختم ہوتا ہوا سگریٹ اس نے برتن میں پھینک دیا اور آہستہ سے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ڈنٹھل جیسے ہاتھ پیچھے کر لیے اور بدن کی ٹہنیاں اُن پر پھینک دیں ——— اور کانچ کی آنکھوں پر سے پلاسٹک کے پوٹے ہٹا کر آنکھیں میری طرف پھیر دیں ———

مجھے یوں لگا جیسے وہ میری ہی آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔ میں اُس کے پاس سے اُٹھ آیا۔

○○

رتن سنگھ

وہ گنتی میں پچاس تھے۔ اکاون بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اس ہال میں جہاں وہ سب مِل کر روز کسی نہ کسی کا سوگ منایا کرتے تھے۔ صرف پچاس آدمیوں کے لیے ہی آسانی سے بیٹھنے کی گنجایش تھی۔ اس لیے ان کی گنتی پچاس ہی رہ گئی۔

وہ پچاس شخص جن میں پچیس آدمی اور پچیس عورتیں شامل تھیں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سوگ ہال میں روز شام کو چھ بجے سوگی لباس یعنی کالے کپڑے پہن کر اکٹھے ہوتے۔ ٹھیک چھ بجے ان کا سکرٹری اسٹیج پر آتا اور پانچ منٹ کی مختصر سی تقریر میں بتاتا کہ سوگ کلب کے ممبر ہر روز کسی نہ کسی کا سوگ منا کر اور اس طرح اس انسان کو یاد کر کے جو اب اس دُنیا میں نہیں رہا ہے انسانیت کی کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے

آخری اُداس آدمی

ہیں۔ پھر گزشتہ روز منائے گئے سوگ کی کامیابی کے لیے سب ممبروں کو مبارکباد دیتا۔ اس موقع پر تالیاں بھی بجتیں جیسے ہی تالیوں کی آواز ڈوبتی۔ سکرٹری اُداس ہو جاتا اور پھر جس آدمی کا سوگ منانا اس دن کے ایجنڈے میں شامل ہوتا۔ اس کے بارے میں جو جو معلومات اسے پتہ ہوتیں اُنھیں بیان کرتا اور پھر جب وہ اپنی تقریر اس جملے پر ختم کرتا کہ آؤ ہم سب مل کر اس شخص کی موت کا سوگ منائیں تو ہال میں کہرام مچ جاتا۔

کوئی چیخ رہا ہے۔ کوئی دھاڑیں مار رہا ہے کوئی چھاتی پیٹ رہا ہے کسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی ہے جس کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے وہ غم کے مارے گم سم اس طرح سمٹ کر ایک کونے میں بیٹھا ہے کہ اگر یہ غم کسی طرح پھوٹ کر باہر نہ نکلا تو شاید اس کا جسم ہی پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ غم کی شدت جب انتہا تک

پہنچتی تو وہ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر روتے کبھی کبھی جب ان میں سے کوئی روتا روتا
بے ہوش ہو جاتا تو دوسرے اس کے منہ پہ پانی کے چھینٹے مار کر اس کے منہ میں پانی ڈال کر
اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے۔ ان میں سے ایک عورت جس پر اکثر بے ہوشی کے
دورے پڑتے تھے وہ خاص طور پر کسی کے ساتھ لپٹ کر ہی روتی تاکہ گرتے وقت اسے کوئی
تھام لے۔

آدھے گھنٹے بعد جب یہ طوفان تھمتا تو وہ لوگ ایک دوسرے کو چپ کرانے کی
کوشش کرتے۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے غسلخانوں
کی طرف جاتے۔ جہاں وہ ہاتھ دھونے کے بعد دوبارہ اس ہال میں گرم گرم چائے یا کافی
پیتے ہوئے ایک دوسرے کے رونے کے انداز کی تعریف کرتے۔ "بھئی آج تو انھوں نے کمال
کر دیا کیا شاندار چیخ ماری۔" بھئی تمھارے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور وہ تو
بالکل بت بن جاتا ہے۔ جیسے لکڑی کا بے جان مجسمہ۔ کوئی ایسا کر کے تو دکھائے۔"

اس طرح ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے اگلی شام
چھ بجے پھر اکٹھا ہونے کے لیے۔

اس طرح یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔

پھر یہ ہوا کہ اُن پچاس میں سے ایک آدمی مر گیا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا اور اس
طرح اب صرف ایک آدمی بچا ہے۔

وہ اب بھی اپنے بوڑھے قدموں سے چلتا ہوا روز چھ بجے اس ہال میں آتا ہے۔
کسی کی یاد میں اسی طرح روتا ہے اور پھر اُداسی کا بُت بنا ہوا خاموش سا بھرے بازار
سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیتا ہے۔

جہاں اب اسے کسی شخص کے مرنے کا دُکھ ہوتا ہے وہاں اُسے اس بات کا بھی غم
کھائے جا رہا ہے کہ وہ جو سب کے مرنے پر روتا رہا ہے اس کی موت کے بعد اس بھری
دُنیا میں کوئی اسے رونے والا اس کی یاد میں آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوگا۔

OO

اقبال مجید

اور تب کرسچین اینڈرسن کے اس عاقل بادشاہ نے اپنی رعایا کی فہم و فراست کو پرکھنے کے لیے یہ کیا کہ وہ اس پوشاک کو پہن کر ہاتھی پر بیٹھا۔ اراکینِ سلطنت اور امرا و منصب داروں کو اپنے ساتھ لیا اور ایک عالی شان جلوس اپنی سواری کا شہر میں نکالا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی رعایا میں کتنے لوگ عقلمند ہیں، کتنے لوگ اس پوشاک کو دیکھ سکتے ہیں کہ جسے وہ زیب تن کیے ہوئے تھا۔

کیونکہ کپڑا بُننے والوں نے یہی کہا تھا کہ جو کپڑا وہ بادشاہ کی پوشاک کے لیے بُن رہے ہیں اس کپڑے کو صرف وہی لوگ دیکھ سکیں گے کہ جو دانا اور عاقل ہیں۔

کپڑا تیار ہوا اس کی پوشاک سلی اور بادشاہ نے اسے پہنا۔ قدِ آدم آئینہ کے سامنے

پوشاک

کھڑے ہو کر جب اس نے اپنا جائزہ لیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ننگا ہے۔ اس کے بدن پر کوئی پوشاک نہیں تھی۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کپڑا جس کی تعریف اس کے درباریوں، وزیروں، دوستوں، عالموں اور خدمت گاروں نے کی ہے وہ پوشاک بادشاہ کو خود کیوں نظر نہیں آرہی ہے وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اگر وہ یہ بات سب سے کہہ دے کہ اس کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں ہے اور وہ ننگا ہے تو پورے دربار میں کہرام مچ جائے گا۔ ہر درباری کو یہ یقین ہو جائے گا کہ ہو نہ ہو اس کا بادشاہ ہی بے وقوف ہے۔ کیونکہ جو کپڑا اُن سب کو دکھائی دے رہا ہے وہ خود بادشاہ کو کیوں نہیں دکھائی دیتا۔

اینڈرسن کا بیچارہ بادشاہ بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ آئینہ کے سامنے اس نے ہر زاویے سے اپنے آپ کو دیکھا لیکن اس کے بدن پر کچھ ہوتا تو نظر آتا وہ تو مادر زاد ننگا تھا اور تب ہی بادشاہ اس پوشاک کو پہن کر دربار میں آیا لوگوں نے آفریں اور مرحبا کی صدائیں بلند کیں بادشاہ کی

پوشاک کی شان میں قصیدے پڑھے اور تب بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ننگا نہیں ہے بلکہ دھیرے دھیرے اسے اپنی پوشاک کے خد و خال نظر آنے لگے، اس کا حسن ابھرنے لگا اور اس کی قدر و قیمت کے جوہر کھلنے لگے۔ اسے لگا کہ اس کے تار تار میں بجلیاں کوندرہی ہیں موتیوں اور جواہرات میں گندھی ہوئی اسے اپنی قبا نظر آئی اس کے ایک ایک بند میں ایک ایک تکمہ میں لعل و زمرد کی لڑیاں دکھائی دینے لگیں اور مادر زاد ننگے بادشاہ نے اپنی سواری شہر میں نکالی تاکہ اس بیش قیمت اور بیش بہا پوشاک کو اپنی رعایا کو بھی دکھا سکے اور اسکی داد و تحسین پا سکے اور اس کی فہم و فراست کا امتحان لے سکے۔

بادشاہ اپنے شاندار ہاتھی پر ننگ دھڑنگ بیٹھا دو رویہ قطار میں کھڑی ہوئی اپنی رعایا کے درمیان سے گزر رہا تھا شہر میں اعلان ہو چکا تھا کہ آج بادشاہ وہ پوشاک پہن کر درشن دے رہے ہیں جو صرف عقلمندوں کو ہی دکھائی دے سکتی ہے۔ لوگ دم بخود مادر زاد ننگے بادشاہ کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے لیکن کسی کی مجال نہ ہوئی کہ بادشاہ کو ننگا کہہ سکتا۔ سب خاموش تھے کیونکہ سب عقلمند تھے لیکن جب بادشاہ ایک بچّے کے قریب سے گزرا جو اپنے دادا کے کندھے پر سوار بادشاہ کو دیکھنے کے لیے ضد کر کے گھر سے آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا تو وہ بادشاہ کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا:

"ارے یہ تو ننگا ہے۔"

دادا نے اسے جلدی سے ڈانٹا اور کہا "چپ بیوقوف!"

بادشاہ سب کچھ جانتا ہے۔
بادشاہ سب کچھ سُن لیتا ہے۔
اور بادشاہ بہت دُور تک دیکھتا ہے۔

اینڈرسن کو یہ ساری باتیں معلوم نہیں تھیں اس لیے اس کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بادشاہ نے بچّے کی وہ بات سُن لی تھی۔ ورنہ آسکر وائلڈ آپ کو یہ بات ضرور بتاتا لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ بادشاہ کے کان بہت تیز ہوتے ہیں اس لیے میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ بادشاہ نے بچّے کے مُنہ سے نکلا ہوا وہ جملہ سُن لیا تھا اور وہ جملہ سُن کر اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا وہ ہاتھی کو تیز تیز ہنکاتا ہوا اپنے

محل واپس آگیا تھا اور اس رات اس نے اپنی رانی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی وہ سیدھا اپنی آرام گاہ میں چلا گیا تھا اور اس نے سخت منادی کرادی تھی کہ اس سے ملنے کی کوشش کوئی نہ کرے وہ رات گئے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا، بار بار اس کے کانوں میں بچّے کی وہ آواز آرہی تھی۔

" ارے یہ تو ننگا ہے
ارے یہ تو ننگا ہے "

وہ اس آواز کی وحشت سے بہت دیر تک لڑتا رہا اور آخر کار نڈھال ہو گیا اس نے خواب آور گولی کھائی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور ہو چکی تھی جب رات کے دو بج گئے اور وہ سو نہ سکا تو اس نے کال بل بجائی اور اپنے پرسنل سکریٹری کو طلب کیا۔ اسے حکم دیا کہ وہ اسی وقت کیبنٹ کو طلب کرے کیونکہ وہ ایک گھنٹہ کے اندر اپنی کابینہ سے مخاطب ہونا چاہتا ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ کابینہ کے ممبر جمع ہوئے اور بادشاہ نے تقریر کی۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ بادشاہ رات ۳ بجے بھی کابینہ کا جلسہ بلا سکتا ہے اس لیے اس نے یہ بات نہیں بتائی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کابینہ کا جلسہ ہوا اور بہت زوردار ہوا اس دن کے جلسے کے ایجنڈے میں صرف ایک ہی موضوع تھا ——— یعنی! ہمارے ملک کے بچّے بے وقوف کیوں ہیں؟

بادشاہ نے اس دن جو تقریر کی وہ بابر کی اس تقریر سے کسی طرح کم نہیں تھی جو اس نے پانی پت کی لڑائی سے پہلے اپنے سپاہیوں کے سامنے کی تھی۔ جب وہ تقریر کر چکا تو ہر ممبر نے فرمائش کر کے اس تقریر کے ٹیپ کو متعدّد بار بجا کر سُنا۔ تقریر کرتے کرتے بادشاہ بچّوں کی بے وقوفی پر ہچکیاں لیتے ہوئے رو پڑا تھا تقریر کے اس رقت آمیز حصّے پر کابینہ کا ہر ممبر رو پڑا اور دیکھتے دیکھتے ہی کیبنٹ ہال ماتم کدہ بن گیا۔ آہ وزاری کے اس سیلاب میں کسی کو اپنے آپے کا بھی ہوش نہ تھا لیکن ان ممبران میں ایک بزرگ عاقل اور دانشمند وزیر بھی تھا اس نے بڑی ہوشیاری سے معاملات کو قابو میں کیا۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ بادشاہ کا کوئی ایسا بزرگ وزیر بھی تھا۔ اس لیے اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس رات اگر وہ وزیر

با تدبیر بادشاہ کو راستہ نہ دکھاتا تو سوائے رونے پیٹنے کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔

تو ہوا یہ کہ اُس وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ بچوں کو عقلمند بنانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور پھر اس نے بادشاہ کے کان میں ایسی تدبیر بتائی کہ بادشاہ اپنی مسند پر سے اچھل پڑا اسی وقت اس فہم و فراست کے پُتلے کو بادشاہ نے خلعت فاخرہ سے نوازا اور اسے پنج ہزاری سے دس ہزاری کے منصب پر فائز کیا۔

اس وزیر کی تدبیر کے مطابق دوسرے دن سیکڑوں گھڑ سوار اپنے اپنے گلوں میں ڈھولک لٹکا کر محل سے نکلا اور بادشاہ کی بادشاہت میں گلی گلی پھیل گئے۔ ان کا کام تھا کہ ڈھنڈورا پیٹ کر بادشاہ کی پوشاک کی خوبیوں، کا بیان کریں اور پھر اس دن سے اُس بادشاہ کی بادشاہت میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، سنیما، اخبار اور رسالوں میں بادشاہ کی اس عظیم پوشاک کا بکھان ہونے لگا۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ اس بادشاہ کے پاس ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما بھی تھا اس لیے اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ بادشاہ کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس کی بات کو دوسروں تک پہونچا سکے صرف یہی نہیں اس نے ایسے ڈاک ٹکٹ چھپوائے جن میں وہ اپنی پوشاک پہن کر کھڑا ہوا تھا جسے عقلمند ہی دیکھ سکتے تھے اس نے گلی گلی چوراہوں پر، بسوں اور ٹراموں میں کھیتوں اور کھلیانوں میں بازاروں اور کھیل کے میدانوں میں، اسپتالوں اور اسکولوں میں دیو ہیکل پوسٹر لگوائے جن پر اس عظیم پوشاک کے ساتھ اس کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔

عقلمند بچو! دیکھو تمھارا بادشاہ کتنی خوبصورت پوشاک پہنے ہے۔

نرسری سے لے کر یونیورسٹی کے نصاب تک ہر مضمون میں بادشاہ کی پوشاک کا ذکر تھا۔ اسکولوں میں گائی جانے والی پیار تھناؤں میں بادشاہ کی پوشاک کی درازی عُمر کی دعائیں تھیں، کاپیوں اور نوٹ بکوں کی جلد پر اس پوشاک کی تصویر تھی۔ ایسے تمام صحافیوں کو ایک ہزاری کے منصب سے پنج ہزاری کے منصب پر لے آیا گیا تھا جنھوں نے اپنے اخباروں کے سب سے زیادہ سنڈے میگزین "پوشاک اسپیشل" کے لیے وقف کر دیے تھے ایسے محققوں کو جاگیریں اور خلعتیں تقسیم کی گئی تھیں جنھوں نے بادشاہ کی پوشاک پر بچوں کے نقطۂ نظر سے تحقیق کی تھی اور ایسے تمام شاعروں کو راج کوی تسلیم کر لیا گیا تھا جنھوں نے خونِ جگر سے

بادشاہ کی پوشاک میں رنگ بھرا تھا۔ بادشاہ نے ایسی تمام انجمنوں اور اداروں کو مالی امداد دینا قبول کر لیا تھا۔ جنھوں نے اپنے منشور اور مقاصد میں بادشاہ کی پوشاک نوازی کو شامل کر رکھا تھا۔

جب بادشاہ کو خبر ملی کہ اب بڑے بڑے شہروں میں ایسی اکیڈمیاں بھی قائم کر دی گئی ہیں جو مختلف زبانوں میں بادشاہ کی پوشاک کے تانوں بانوں کے ایک ایک تار کو کھول کر رکھ دیں گے اور . . . اس کے چھپے ہوئے حسن کو بچے بچے کے دماغ میں پیوست کر دیں گے تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اکیڈمیوں کے ناظموں کو مبارکباد کے تار بھیجے اور ساتھ ہی اسی پوشاک میں کھنچوائی ہوئی اپنی ایک ایک تصویر بھی بھیجی جس پر بادشاہ نے جوشِ مسرت میں اپنے آٹوگراف بھی دے رکھے تھے اور جسے ان لوگوں نے اپنی اپنی میزوں کے شیشوں کے نیچے سجا رکھا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ سگریٹ کی ڈبیوں پر، ماچس کے لیبل پر، لفافوں اور پوسٹ کارڈوں پر، ٹیلی گرام اور منی آرڈروں پر، پیپرویٹ اور فاؤنٹین پینوں پر، کوٹ، شیروانی اور سوئٹر کے بڑے بڑے بٹنوں پر، دودھ کے ڈبوں اور دودھ کی شیشیوں پر، وزن بتانے والی ٹکٹوں پر، پاپڑ، گرم مسالوں اور دالوں کے پیکٹوں پر، کیش میموں اور رسیدوں پر، لانڈری کے کھڑکھڑاتے ہوئے لفافوں پر مٹھائی کے ڈبوں، لاٹری کے ٹکٹوں پر، اسپتالوں کے آؤٹ ڈور نسخوں پر، بجلی کے بلوں پر، ریڈیو، موٹروں اور اسکوٹروں کے لائسنسوں پر، بینک کی پاس بکوں پر، ٹیلی فون کی ڈائرکٹریوں پر، ریلوے ٹائم ٹیبلوں پر، غرضیکہ بادشاہ کی پوشاک کا بلاک ہر جگہ نمایاں روشنائی میں چھپا ہوا دکھائی دینے لگا۔

کیونکہ اینڈرسن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ اتنی ڈھیر ساری چیزوں پر اپنی پوشاک کی کیفیت چسپاں کر سکتا ہے اس لیے اس نے آپ کو یہ سب نہیں بتایا لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بادشاہ نے صرف ایسا ہی نہیں کیا بلکہ ملک کے بہترین انجینیروں، ڈاکٹروں، سائنسدانوں اور فلسفیوں کو اس بات کے لیے مقرر کیا کہ وہ شب و روز لیباٹریوں اور ریسرچ سنٹروں میں اس کی پوشاک کے بخیے اُدھیڑتے رہیں۔ اس نے ایسی فلموں کے ڈائرکٹروں، پروڈیوسروں اور ایکٹروں کو انعامات دیے جو اس کی پوشاک کے تمام زاویوں کو پیش کر کے بچوں کے ذہنوں کی تربیت کرتے تھے۔ اس نے ایسے تمام استادوں کو خصوصی تمغے اور نقد رقمیں عطا کیں جو

تختہ سیاہ پر اس کی پوشاک کا خاکہ کھینچنے میں پچاسوں من کھڑیا مٹی صرف کر چکے تھے وہ ہر سال ایسے تمام فوجی افسروں اور پولیس کے سپاہیوں کی بیواؤں کو سونے اور چاندی کے میڈل بھی تقسیم کرتا رہا جو اس کی پوشاک کے ناموس کے تحفظ میں اپنی جانیں دے چکے تھے۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایسا کچھ ہوتے ہوتے ہوئے برسوں گزر گئے اور کیونکہ تب اینڈرسن کو مرے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے اس لیے وہ یہ بتانے سے قاصر رہا کہ اس کہانی کا کیا اثر ہوا لیکن میں آپ کو اس کے آگے کی کہانی بتاتا ہوں:۔

ہوا یہ کہ کئی برس بعد جب بادشاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ اب اس کے ملک کے بچے عقلمند ہو چکے ہوں گے تو اس نے ان کے امتحان کی تیاری شروع کی۔

ایک شاندار جلوس پھر نکالا گیا۔ ہاتھی، گھوڑے، فوج اور بینڈ باجے کے ساتھ بادشاہ کی سواری بھی نکلی۔ اس روز پھر بادشاہ نے اپنے جسم پر وہی لباس زیب تن کیا تھا اور وہ ایک اونچے سے ہاتھی پر جلوہ افروز تھا اُس نے دیکھا چھوٹے بڑے بچے سیکڑوں کی تعداد میں سڑک کے دونوں طرف قطاروں میں کھڑے ہیں، ان کے ننھے ننھے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے جھنڈے ہیں جن پر راجہ کی پوشاک کی تصویر بنی ہے جنہیں بچے لہرا لہرا کر خوشی سے تالیاں بجا رہے ہیں۔ بادشاہ کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس کی آنکھیں بیقراری کے ساتھ اس مجمع میں اس بچے کو تلاش کر رہی تھیں جو کچھ عرصہ پہلے اپنے دادا کے کندھوں پر بادشاہ کا جلوس دیکھنے آیا تھا۔

شاہراہ کے دونوں طرف سیکڑوں مرد، عورت اور بچے تھے جو بادشاہ کی پوشاک کے ترانے گا رہے تھے۔ بادشاہ اپنی بے قرار آنکھوں سے بار بار بچوں کی بھیڑ میں اس بچے کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کی یادداشت میں اس بچے کی ایک ہلکی سی تصویر باقی تھی۔ بادشاہ کا جلوس دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ چوراہوں اور موڑ پر سے نکل رہا تھا اور بادشاہ بار بار بے قرار ہو کر اس بچے کو تلاش کر رہا تھا جب بھی وہ بچوں کے پاس سے گزرتا۔ اس کے کان ان کی آوازوں پر لگ جاتے وہ سب اس کی پوشاک کا قصیدہ پڑھ رہے تھے پورے شہر کا گشت لگانے کے بعد بھی بادشاہ کو وہ بچہ نہیں دکھائی دیا۔ بادشاہ جانتا تھا کہ وہ بچہ اب بڑا ہو چکا ہوگا۔ اتنا بڑا کہ اس کا ناک نقشہ اور اس کے خدوخال بدل چکے ہوں گے لیکن بادشاہ کو جیسے اب بھی یقین تھا کہ وہ اُس بچے کو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی پہچان لے گا ان آنکھوں کی

چمک سے پہچان لے گا جو اس نے بچّے کی آنکھوں میں دیکھی تھی اور جو سب سے مختلف تھی۔ بادشاہ ایک ایک بچّے کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا بے چین ہو کر وہ ایک ایک بچّے کی نظروں کو ٹٹول رہا تھا لیکن وہ بچّہ اسے کہیں نہ ملا۔ جلوس پورے شہر میں گھوم کر شام ہوتے ہوتے محل میں واپس آگیا۔

بادشاہ بھاری دل کے ساتھ اپنی آرام گاہ میں داخل ہوا وہ اپنی رانی سے بھی نہیں ملا۔ اس نے منادی کرا دی کہ کوئی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے، تھکے ہارے جسم کو اس نے اپنے بستر پر ڈال دیا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے ایک بوجھ اس کی چھاتی پر رکھا ہے۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس بچّے کا چہرہ آرہا تھا بار بار اس کے کانوں میں اس بچّے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے نیند کی گولی کھا کر سو جانا چاہا لیکن اسے نیند نہیں آئی آدھی رات گئے تک وہ بیقراری کے ساتھ ٹہلتا رہا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور آنکھیں تپ رہی تھیں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچے اس کا بدن جیسے پھنکنے لگا تھا۔ اس نے کال بل بجائی اور بیہوش ہو گیا۔ بادشاہ کے پرائیویٹ سکریٹری نے جب اُسے ایسی حالت میں دیکھا تو وہ دوڑ کر شاہی طبیب کو بلا لایا۔ طبیب نے بادشاہ کو غور سے دیکھا۔ بادشاہ کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ طبیب اپنے کان اس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا بادشاہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا:

"وہ بچّہ کہاں ہے؟"

بس اسی گھڑی سے شاہی طبیب اس بچّے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بادشاہ کی سلطنت بہت بڑی تھی طبیبوں کا خیال تھا کہ شاید کسی کونے میں ایک ہی بچّہ ایسا مل جائے جو بادشاہ کو اس موذی مرض سے بچا سکے۔ طبیب ہزاروں بچّوں سے ملے لیکن جس بچّے سے وہ بات کرتے وہی بچّہ جب عقلمند نکلتا تو ان کی مایوسی اور بڑھ جاتی در اصل انھیں ایک بیوقوف بچّے کی تلاش تھی۔ سارے ملک میں گھوڑے دوڑائے جا چکے تھے لیکن ریاست کے ہرکارے ہر جگہ سے ناکامی کی خبر لا رہے تھے انھیں پوری ریاست میں ایک بھی بچّہ بیوقوف نہیں مل سکا۔ ادھر بادشاہ کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی آخر کار شاہی طبیبوں نے فیصلہ کیا کہ ایک بچّے کو تیار کر کے بادشاہ کے سامنے لے جائیں جس سے ممکن ہے کہ بادشاہ کے مرض کو کچھ افاقہ ہو سکے۔

ایک چھوٹے بچّے کو طبیبوں نے تیار کیا۔ بچّے کو بتایا گیا کہ جب وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو تو وہ بادشاہ سے کہے "بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

جب بچہ اس بات کو اچھی طرح سیکھ چکا تو اسے بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ بچہ سب سے پہلے بادشاہ کے سامنے ادب سے کورنش بجا لایا اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر اور گردن جھکا کر سہراب مودی کی طرح بولا "بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

یہ سُن کر بادشاہ نے آنکھیں کھول کر بچّہ کی طرف دیکھا اور پھر وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے کھڑے بچّے کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کے چہرے کو قریب کر کے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔ "ایک بار پھر تو کہو میرے بچّے۔"

بچّہ نے پھر سہراب مودی کی طرح بولا۔ "بادشاہ جی آپ ننگے ہیں۔"

بچّے کا چہرہ سپاٹ تھا، اس کی آواز سپاٹ تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں وہ روشنی نہیں تھی جو بادشاہ نے سڑک کے کنارے ایک بوڑھے کے کندھے پر بیٹھے ہوئے ایک بچے میں دیکھی تھی۔ اس نے پیار سے بچّے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"یہ بات تمھیں کس نے بتائی بیٹے۔"

بچہ یہ سُن کر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ بادشاہ نے اسے ایک چاکلیٹ دیتے ہوئے کہا: "تم ڈرو نہیں مجھے بتا دو کہ یہ بات تمھیں کس نے بتائی۔" بچہ چاکلیٹ کو کھولتے ہوئے بولا:

"مجھے تو آپ کی پوشاک اچھی لگتی ہے لیکن یہ بات مجھے بڑے حکیم صاحب نے بتائی تھی۔"

یہ سنتے ہی بادشاہ نے دونوں ہاتھوں سے بچّے کا گلا پکڑ لیا۔

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اس نے پوری بربریت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اس بچّے کا گلا گھونٹ دیا بچّے کی مُردہ مٹھی میں آدھی کھُلی ہوئی چاکلیٹ اب بھی دبی تھی اور تب ہی بادشاہ نے اپنا وہ تاریخی فرمان جاری کیا جس کی رو سے پورے مُلک میں منادی کرا دی گئی کہ اب بادشاہ کی مملکت میں کسی بچّہ کو بچّہ نہیں رہنے دیا جائے گا کیونکہ جتنا وقت محنت اور سرمایہ ایک بچّہ کو عقلمند بنانے میں لگتا ہے اس سے کہیں کم وقت میں وہ بچّہ بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔

پھر اس بادشاہ کی مملکت میں بچّوں سے ان کا بچّہ پن کیسے چھین لیا گیا اور اس بادشاہ کا مرض کیسے ٹھیک ہوا۔ یہ بات اینڈرسن کیسے جان سکتا تھا جب کہ یہ بات خود مجھے بھی نہیں معلوم لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہی کوئی بہت جلد ضرور آپ کو اس کہانی سے آگے کی وہ کہانی بھی سُنائے گا جسے نہ اینڈرسن پوری کر سکا اور نہ میں ——————

○○

بلڈاغ کومل

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصّوں میں پانی کے نل مہیا کردیے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نتیجتاً اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا مشغلہ باقاعدہ طور پر اختیار کرلیا۔ جب وہ ایک کنواں پھلانگ چکتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ ایک اور کنواں پھلانگے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورتِ حال کا انتخاب کرتا اور تماشائیوں کی تالیوں اور واہ واہ کے درمیان کنواں پھلانگنے میں کامیاب ہوجاتا۔ اس کی مقامی شہرت رفتہ رفتہ قومی شہرت کا درجہ اختیار کرگئی اور اب اس کا نام بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا۔

کنواں

کسی بھی فرد کا کوئی دعویٰ ایسا نہیں ہے جس کو چیلنج کرنے کے لیے دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چنانچہ گولنکر کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ڈاک سے ایک خط ملا۔ یہ خط ایک اجنبی کی طرف سے تھا جس نے گولنکر کو کنواں پھلانگنے کے مقابلہ کے لیے چیلنج بھیجا تھا گولنکر نے خط پڑھا اور خط پڑھتے ہی اس کے مردانہ وقار نے تقاضا کیا کہ وہ چیلنج منظور کرلے۔ چنانچہ گولنکر نے فوراً چیلنج کرنے والے کو تحریری اطلاع دی کہ وہ کسی وقت بھی باہمی خط وکتابت کے ذریعہ طے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہوگئیں۔ اور مقابلے کی تاریخ مقرر کردی گئی مقامی اور قومی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کردیا گیا۔

اگرچہ گولنکر کہنہ مشق کھلاڑی تھا اور بہت سے کنویں پھلانگ چکا تھا۔ جوں جوں مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے ان خدشات پر قابو پانے

کے لیے گولنکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس سے لیے مقابلہ سے قبل کنواں پھلانگنے کی کچھ مشق ضروری ہوگی۔ جو مقابلے کا فیصلہ نتیجہ کن انداز سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد گولنکر نے شہر کے تمام کنوؤں کا (جن میں سے اکثر وہ پھلانگ چکا تھا) بغور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنوئیں کا قطر ناپا۔ پھلانگنے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے گولنکر جیسی شہرت کے مالک کے لیے شہر کے کنوؤں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کے لیے شہر سے باہر ایک ویران کنوئیں کا انتخاب کیا۔ یہ کنواں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا باہر سے گزرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنواں ہے اس کنوئیں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی منڈیر، اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خالی زمین کا حدود اربعہ اس کنوئیں کے مماثل تھا جو آخری مقابلہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

کنوئیں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب تیاری کی ضرورت تھی۔ گولنکر نے تمام تیاری دو چار روز میں مکمل کر لی اور ایک صبح کنوئیں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مارچ کی یہ صبح بڑی خوبصورت تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا لوگوں کے چہروں پر مسرت تھی بچے آنگنوں میں کھیل رہے تھے زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گولنکر رنگ و بو کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے دھیرے دھیرے تیز ہوتے ہوئے ہاؤ ہو میں سے گزر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے کنواں پھلانگنے کی مشق کرنی تھی اس کا دل اس کا دماغ اس کا پورا وجود زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم اعتماد سے اٹھ رہے تھے اور اس کے چہرے پر کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلے میں شامل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ جیت چکا ہو۔

شہر کی ایک نواحی بستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گزرا۔ سبزے پر کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے ٹھیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چھکا لگایا۔ گولنکر کا دل مسرت سے چھلک اٹھا۔ نواحی بستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آ گیا جہاں خوبصورت بنگلوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی ایک مکان کے باہر ایک گول مٹول، سرخ و سپید بچہ ٹافی کھا رہا تھا۔ گولنکر نے اس کے ملائم صحت مند گالوں کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ

گیا۔

اب وہ درختوں کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فطرت کا سارا حسن کھیتوں کی ہریالی اور سونے میں سمٹ آیا تھا، گولنکر کچھ دیر اس حسن سے سرشار ہوتا رہا اور پھر جھنڈ کے اندر داخل ہوگیا   کنوئیں کے قریب پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کنوئیں کی منڈیر پر سوکھا مارا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے کنوئیں کے اندر جھانک رہا تھا اجنبی گولنکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا اس لیے جب گولنکر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑا۔ گولنکر نے اپنے ردِ عمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا:

"تم کون ہو؟"

اجنبی اب بھی کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور گولنکر پر ایک تحقیر آمیز نظر کر کے کنوئیں کے اندر جھانکنے کے عمل میں دوبارہ مصروف ہوگیا تھا۔

گولنکر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گولنکر نے اپنا سوال دہرایا:

"میں پوچھتا ہوں، تم کون ہو؟"

اجنبی دوسری بار بھی خاموشی سے گولنکر کا سوال ہضم کر گیا۔

گولنکر نے تیسری بار کوشش کی۔ اس بار اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میں پوچھتا ہوں تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟"

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنوئیں کے پیندے سے ہٹائیں اور گولنکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گولنکر کو ایسا لگا کہ محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی رُوح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جا رہا ہے گولنکر کے چہرے پر غصّے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ گولنکر اپنے غصّے کا اظہار کر پاتا۔ اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے:

"دو انسانوں کے درمیان ہمدردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے مقاصد ایک جیسے ہوں۔"

"تو تم ہمدردی کی تلاش میں ہو۔"

"شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ

استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا ہوں۔"

گولنکر چکر میں آگیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا:

"دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" گولنکر نے پوچھا۔

"میں چاہنے یا نہ چاہنے کے عمل سے بہت دُور نکل چکا ہوں۔"

گولنکر کے ذہن میں ایک اور سوال کوندے کی طرح لپکا۔

"کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟"

"زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔" اجنبی نے جواب دیا۔

گولنکر کے چہرے پر مسرت اور اعتماد کی روشنی نمودار ہوئی وہ اجنبی کی پُراسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں؟"

"مجھے اب دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

گولنکر کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"یقیناً تمہارا گھر ہوگا۔ تمہاری بیوی ہوگی، بچے ہوں گے۔"

"تھے! اب نہیں ہیں۔" اجنبی نے ایک بار پھر کنوئیں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کہاں گئے؟"

"مر گئے۔"

"کس طرح مر گئے؟"

"جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے، بیماری سے، قتل سے۔"

"یہ تو عام بات ہوئی خاص طور پر تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟"

"اجنبی شاید گولنکر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کے جواب دے چکا تھا اس لیے برہم ہو کر بولا:

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟"

"کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے میں تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

دوستی کے نام پر اجنبی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پورے زور سے چیخا:

"چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔"

گولنکر مسکرایا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تو پھر تم کون ہو؟" اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود حیران ہو گیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا۔ میرا نام گولنکر ہے میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنواں پھلانگنے والا ہوں۔"

"مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں میرے ساتھ دلچسپی ہے اسی لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟"

اجنبی کی آنکھوں میں غصّے کی بجلی ایک پل کے لیے لہرائی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"مجھے کنواں پھلانگنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"نہ سہی۔ لیکن میں کنواں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو۔ جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر۔۔۔"

اجنبی کے یہ الفاظ سُن کر گولنکر سنّاٹے میں آ گیا۔

"شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو۔"

"جی ہاں۔ اپنے تمہارے تمام انسانوں کے۔"

"لیکن تمہارے بیوی بچّے کیا ہوئے؟"

اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی گزرنا چاہتا ہے۔

"جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل۔۔۔"

"لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔" گولنگر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

"میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ تم کنوئیں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازدار بن گئے ہو۔"

"خودکشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے۔"

"ہر انسان اپنا ہی تو مسئلہ حل کرتا ہے۔"

گولنگر کو اجنبی کی باتوں سے جو دلچسپی پیدا ہوگئی تھی مزید گہری ہوگئی۔

"لیکن اس زندگی کے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں۔"

"جی ہاں میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر حاوی ہیں۔ فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔"

"فرض کرو تم خودکشی کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے کیوں کہ میں تمھیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ تو کیا تمھارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہوجائیں گے۔"

"مجھے اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کرچکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کے لیے کبھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم نادان ہو۔"

"کون جانتا ہے کون نادان ہے۔"

دونوں آدمی اپنے اپنے سوالات اور جوابات میں اُلجھ گئے تھے تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہوگئے۔ گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا:

"تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کرسکے!"

اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہوئی۔

"میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا رہا ہوں۔"

"تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو۔"

اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے :

"میں نے کہا نا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"اگر یہ فیصلہ تمھارا آخری فیصلہ ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمھیں کیا زحمت ہے؟"

"میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے۔ میں یہ حق تمھیں کبھی نہیں دے سکتا۔"

"میں اسے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوبصورت ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے تمھارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرضِ محال اگر زندگی خوبصورت بھی ہے تو تمھیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلہ پر عمل کرنا چاہتے ہو۔ تم بخوشی خودکشی کرو۔ میں یہاں سے چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گولنکر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا اور کنوئیں کے اندر کودنے کے لیے تیار ہو گیا۔

گولنکر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آگیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا :

"میرا ایک آخری سوال باقی ہے۔"

"پوچھو۔" اجنبی نے فاتحانہ انداز میں کہا :

"تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟"

"تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟"

"میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا۔"

"ٹھیک یہی بات میں کہتا ہوں۔ یہ کنواں میرے لیے مناسب تھا۔"

اس جواب سے گولنکر کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا:

"کیا تم اپنی خودکشی چند منٹوں کے لیے ملتوی کر سکتے ہو؟"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کرنے کے لیے آیا تھا کیوں کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے لیے مقابلہ میں حصّہ لینا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔ تم سمجھتے ہو۔ اس مسخرے پن سے تم مجھے متاثر کر لوگے۔"

"تمھیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں جہاں تک تمھیں متاثر کرنے کا تعلق ہے۔ تم جہنم میں جاؤ۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"شوق سے پورا کرو۔ لیکن جلدی، کیونکہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے صبر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر اجنبی کنوئیں کی منڈیر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ گولنکر نے کنوئیں کی منڈیر سے مخصوص فاصلہ ناپ کر زمین پر کچھ نشان لگائے۔ ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ اپنے جسم کو تولا اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کنوئیں کی جانب بڑھا راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے بھرپور جست لگائی۔ اجنبی کے دل کی دھڑکن اس دوران میں تیز ہوگئی۔ جست لگاتے ہی گولنکر کا جسم ہوا میں ایک قوس سی بناتا ہوا کنوئیں کے اوپر سے گزرنے لگا اور عین اس لمحہ جب اجنبی کو توقع تھی کہ گولنکر کنوئیں کے دوسری طرف ہوگا ایک پُر زور دھماکہ ہوا گولنکر کا جسم کنوئیں کی منڈیر کی اندرونی سطح کے ساتھ زور سے ٹکرایا اور پھر کنوئیں کی پوری گہرائی کا فاصلہ طے کرتا ہوا دھم سے پانی میں جا گرا۔

اجنبی کی آنکھیں پھیل کر روزن بن گئیں اس کا پورا وجود فطری ردِ عمل کی زد میں آگیا۔ اور وہ ڈوبنے والے کی تقدیر سے غافل اپنے ارادوں اور فیصلوں سے غافل، درختوں کے جھنڈ کو چیرتا، سرسبز شاداب کھیتوں کو اپنے پانو تلے روندتا شہر کی جانب بھاگ نکلا۔ ○

راج

"ظالم لوکی نہیں شیریں تیرے شہر دے ——— ہوا ——"
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا کہیں دور خلا میں گھور رہا تھا۔
"کھڑکی سے ہٹ جاؤ" میں نے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔
اس نے گردن گھمائی اور میرے چہرے کو تکتے ہوئے، کچھ ایسے جیسے اسے یہ بات کہنے میں تامل ہو رہا ہو، بولا۔ "یہ شیریں کے شہر کے لوگ ——— وہ اتنے ظالم کیوں ہیں؟
"مجھے پتہ نہیں" میں نے جواب دیا۔ کھڑکی بند کر دو۔ دیکھو کتنی گرم لو آ رہی ہے۔
اس نے چہرہ میری طرف سے ہٹا لیا اور پھر باہر دیکھنے لگا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مجھے نیند نہ آئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب بھی وہ شیریں

امشب صدائے تیشہ

کے شہر کا ذکر چھیڑتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی روح میں ایک طوفان سا اٹھ رہا ہے۔
آخر میں اونگھ گیا لیکن فوراً ہی اس نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ وہ بہت ہی مضطرب تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔
"وہ پہاڑی ——" اس نے انگلی سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ "ہونہہ"؟ میں نے کہا
"کچھ نہیں" وہ بولا اور پھر خلا میں گھورنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے سنا وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"دور اس پہاڑی پر
اک الاؤ جل رہا ہے
اور چند دیوانی روحیں

چیختی چلّاتی ہیں
اپنے لمبے بازوؤں سے
کسی کو یوں بلاتی ہیں؟
اپنے۔ لمبے۔ بازوؤں سے —— کسی کو۔۔۔"

ظاہر تھا وہ آپے میں نہیں تھا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کھڑکی بند کر دی۔ پھر میں نے کندھے سے پکڑ کر اسے پلنگ پر لٹا دیا اور اس کا سر تھپتھپانے لگا۔ یکایک وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"ذرا کھڑکی کھول دو۔ شاید نیچے منادی والا ہے۔" وہ بولا اور کان لگا کر کسی آواز کو سننے لگا۔
"اب سو جاؤ، تم بہت تھک گئے ہو۔" میں نے کہا۔" اور —— اور پھر رات ہمیں جاگنا بھی تو ہے۔"
"کیوں؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔
"آج رات انسان چاند پر اُترنے والا ہے۔" میں نے جواب دیا اور اس کا سر تھپتھپاتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا ہیجان کم ہوتا گیا اور آنکھیں مندنے لگیں پھر اس نے کروٹ لی اور چند ہی لمحوں بعد وہ گہری نیند سو گیا۔
میں نے کھڑکی کھول دی، اور باہر دیکھنے لگا۔ سامنے دریا تھا۔ ایک سڑک دائیں طرف سے آرہی تھی اور دریا پر سے گزرتی ہوئی اس پار بائیں کنارے پر نکل آئی تھی اور پھر بہت آگے جا کر ایک پہاڑی کے پیچھے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔
ایک روز جب ہم دونوں کھڑکی میں کھڑے باہر دیکھ رہے تھے تو اس نے پوچھا تھا: یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"
مجھے شرارت سوجھی: شیریں کے شہر" میں نے جواب دیا۔
"یہ شیریں کون ہے؟" اس نے سوال کیا۔
"یہ بھی ایک داستان ہے، پھر کبھی سناؤں گا۔"
اور پھر ایک رات جب ہم سونے لگے، تو وہ بولا۔ "وہ شیریں والی داستان —— تمھیں یاد ہے نا، تم نے وعدہ کیا تھا۔"
"اچھا، مگر سو مت جانا۔"

"میں ہنکاری بھرتا رہوں گا۔" اس نے یقین دلایا۔
"تو سنو۔" میں نے کہا "ایک تھی شیریں،"
"ہوں۔"
"ایک تھی شیریں،
ایک تھا کوہکن . . ."
"ہوں۔"
"ایک تھی شیریں،
ایک تھا کوہکن،
اک پہاڑ . . ."
"ایک تھی شیریں، ایک تھا کوہکن، ایک پہاڑ —— اس نے دہرایا۔
"ایک تھا کوہکن
ایک پہاڑ . . ."
"یہ شیریں کہاں چلی گئی؟" اس نے سوال کیا۔
"دیکھو بیچ میں مت ٹوکو۔" میں نے جھلّا کر کہا
"اچھا اب نہیں ٹوکوں گا۔" اس نے وعدہ کیا
"ایک تھا کوہکن،
"ہونہہ"
اک پہاڑ
"ہونہہ۔
ایک تھا تیشہ،
اک پہاڑ . . ."
اس بار اس نے ہنکاری نہیں بھری، شاید وہ سو گیا تھا اسے نیند آنے لگی تھی۔
ایک تھا تیشہ۔
ایک تھا تیشہ
ایک تھا تیشہ

ٹھک ٹھک ۔ ٹھک ٹھک ۔ ٹھک ٹھک ۔ ٹھک ٹھک . . . "

اس کے چند روز بعد ایک دن جب اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ "سنو یار، آج میں نے بہت لمبی سیر کی ہے ۔ یہ اس دریا کے ساتھ ساتھ ـــــ" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"اچھا ؟"

"ہاں ۔" اس نے مختصراً کہا اور رک گیا اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا : جوں جوں میں چلتا گیا ۔ اس کا پانی شفاف ہوتا گیا ۔ حتیٰ کہ ایک جگہ مجھے اپنی رُوح کا عکس نظر آنے لگا . . . "

"اور جسم کا عکس ؟" میں نے اسے ٹوک دیا ۔

"پتہ نہیں ۔" اس نے جواب دیا ۔

"لیکن یہاں تو یہ دریا . . ." میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا ۔

"ہاں ، یہی تو اس کا المیہ ہے ۔" اس نے ایک لمبی سی سانس لے کر کہا اور خاموش ہو گیا ۔

اُس رات وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا ۔ اس کے جملے خاصے بے ربط تھے ۔ کچھ دیر بعد وہ چونک کر جاگ گیا ۔ اور آنکھیں مَلتا مَلتا مجھ سے بولا : جانتے ہو ، خدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا ؟

"اب سو جاؤ ،" میں نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا ۔ وہ لیٹ گیا اور میں نے بتی بجھا دی لیکن اندھیرے میں مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ کہہ رہا ہے ۔ میں نے غور سے سُنا ۔ وہ پھر بڑبڑا رہا تھا :

ایک بحرِ بے کراں ۔

افق تا افق

اک ردائے نیلگوں

فلک در فلک

ایک نغمہ ، ایک گیت

عرش تا فرش ، فلک در فلک ، افق تا افق . . .

اس کے بعد وہ کافی دنوں تک نظر نہ آیا۔ میں نے کئی دفعہ اُسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر ایک روز جب میں سو کر اٹھا، تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کمرے میں بیٹھا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی تھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"کہاں رہے اتنے روز؟" میں نے گلہ کیا۔

"شیریں کے شہر گیا تھا"

"شیریں کے شہر!" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں" اس نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور بات بدلنے کی غرض سے بولا۔ "سنا تم نے! آج رات انسان کو چاند پر اتارنے کے لیے راکٹ داغا جائے گا۔"

اس نے کوئی توجہ نہ دی اور خاموش رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا "ایک روز ایک منادی والا یہاں آیا تھا"

"اچھا؟"

"ہاں" وہ بولا، اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اور جیسا کہ ان منادی والوں کا دستور ہے، یہاں اس کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر وہ ہانک لگانے لگا:

سنیئے جناب والا۔ کیا کہتا ہے منادی والا۔۔۔"

اس نے بالکل منادی والے کی نقل اتارنی شروع کر دی:

"منادی سننا غور سے، پھر بات کرنا کسی اور سے

ہاں تو، صاحبان، آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی۔

کہ آج شام شیریں کے شہر میں فرہاد کو

نیلام کیا جائے گا، مال کو موقع پر آ کر

دیکھیے اور پرکھیے اور بولی دے کر ثواب کمائیے

——— وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا، "ہاں تو، میں اس منادی والے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ سارا شہر گھومنے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لیے دریا پار کر کے

اس پار پہونچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ ریت یوں چمک رہی تھی جیسے کسی نے سورج کو ریزہ ریزہ کر کے اسے زمین پر بکھیر دیا ہو۔ پیاس کے مارے حلق سوکھا جا رہا تھا اور پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ میرا رہبر میری موجودگی سے بے خبر اپنی راہ چلا جا رہا تھا اور میں گرتا پڑتا اس کا دامن تھامے اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ جب وہ اپنے جوتے میں سے ریت نکالنے کے لیے رکا تو میں اس کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"وہ شہر ——— اب کتنے کوس باقی ہے؟" میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

"تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہاں فاصلے کوسوں میں نہیں ناپے جاتے" اس نے درشتی سے جواب دیا۔

"خیر، اتنا تو بتا دو ہم کتنی دیر میں وہاں پہونچ جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم کتنی دیر میں وہاں پہونچنا چاہتے ہو" اس نے جواب دیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد گویا اس کا مخاطب میں نہیں تھا وہ خود تھا بولا "اور اس پر کہ تم وہاں پہونچنا چاہتے بھی ہو، یا نہیں۔ کئی لوگ منزل پر پہونچ کر بھی واپس مڑ جاتے ہیں۔"

"ممکن ہے وہ منزل کی تاب نہ لا سکتے ہوں" میں نے نیم استفسار کے لہجے میں کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلتا رہا۔ اب دور حدِ نگاہ پر شہر کے مینار دکھائی دینے لگے تھے اور اُن کے پس منظر میں افق تھا ——— سُرخ، بھیانک، زمین کو چومتا ہوا سا۔

"بوسۂ مرگ" میرے منہ سے نکلا۔

"کیا کہا؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں ——— سنو تو، یہ ٹھک ٹھک کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟" میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

اس نے جواب دینے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔

شہر کے قریب پہونچ کر میں نے دیکھا کہ فصیل کے باہر لوگوں کا ایک جمِ غفیر امڈا چلا آ رہا ہے فصیل کے اوپر ایک چبوترہ سا بنا تھا جس پر ایک شخص کھڑا تھا۔

"کیا یہی وہ شخص ہے جس کی نیلامی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے کہا اور تیزی سے چلتا ہوا اس ہجوم میں غائب ہو گیا۔ فصیل کے

نیچے میدان میں ایک بہت بڑی تختی لگی تھی۔ جس پر مختلف انسانی اعضا کی شکلیں بنی تھیں، اور اُن کے سامنے اس عضو کو خریدنے والے کی طرف سے دی گئی بولی درج تھی۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ پیش کش لاکھوں روپے کی تھی۔ ہاں، البتہ روح کا خانہ خالی تھا۔ اس کے لیے کوئی پیش کش نہ تھی۔

میں نے شہر کا رُخ کیا۔ شہر بالکل سنسان پڑا تھا۔ کیونکہ سب لوگ باہر نیلامی پر گئے ہوئے تھے۔ صدر دروازے کے پاس ہی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے باہر ایک بوڑھا چوکیدار اونگھ رہا تھا۔

عمارت کے اندر بہت سی کلیں رکھی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے شاید میرا سوال نہیں سُنا، اور مجھے اس کل کی طرف لے گیا۔ جس میں ہاتھ جُتے تھے۔ وہ مٹھی کھولتے اور بند کرتے رہتے تھے اور جب مٹھی کھلتی تو چند سکے زمین پر گر جاتے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پھر پوچھا —— اُس نے شاید پھر میرا سوال نہیں سُنا اور پھر مجھے لے کر آگے بڑھ گیا۔ جہاں زبان جُتی تھی —— الفاظ ہی الفاظ۔ ہر زبان میں، ہر لہجے میں، ہر آواز میں۔

"یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ جہاں ایک اور کل تھی . . . اور ایک اور . . . اور ایک اور . . .

میں عمارت سے نکل آیا ——

شہر کے دروازے پر وہی منادی والا میری راہ تک رہا تھا۔

"میرا خیال تھا تم یہیں ہو گے" اس نے کہا۔

"ہاں، لیکن یہ تو بتاؤ —— یہاں شیریں کے شہر میں —— روح ——؟"

"تو پھر تیشہ کون چلائے گا؟" اس کو اس سوال کی جیسے پہلے سے ہی توقع تھی۔

"تیشہ؟ لیکن کیوں؟"

کہتے ہیں پہاڑی کے اس طرف دودھ کا دریا ہے اس نے جواب دیا اور مجھے بازو

سے پکڑ کر فصیل کی طرف چل پڑا۔

ہمارے نیچے پہونچنے تک بولی شروع ہو چکی تھی اور سب لوگ نیچے میدان میں جمع تھے وہ منادی والا ان میں شامل ہو گیا۔

"پچیس روپے"

"پچیس روپے"

"ستائیس روپے"

میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ چبوترے پر اکیلا کھڑا تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں اس کے پاس پہونچا اور اس کے کان میں کہا "تم باز نہیں آئے نا، میرے اتنا منع کرنے کے باوجود یہاں آ پہونچے ہو۔" میں نے اسے ملامت کی۔

"اور کیا کرتا، اس نے جواب دیا "میرا مقدر یہی ہے"

"لیکن ایک بات ضرور ہے دوست۔ ہو بڑے خوش قسمت، تمھاری قیمت لاکھوں روپے لگ چکی ہے۔ میں خود حساب لگا کر آیا ہوں" میں نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش کی۔

"تمھیں سخت دھوکا ہوا ہے" وہ بولا "یہ قیمت میرے جسم کی ہے میری نہیں"

نیچے نیلام جاری تھا۔ اٹھائیس روپے، انتیس روپے، انتیس روپے ایک... انتیس روپے دو... "انتیس روپے..."

"تیس،"

"تیس،"

"تیس ——— تمام ہجوم بیک آواز پکارا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی، صرف دور پہاڑی پر سے ٹھک ٹھک کی آواز برابر آ رہی تھی۔

"یہ بولی تیس روپے پر کیوں رُک گئی؟" میں نے بالآخر پوچھا۔

"میں نے کہا تھا نا، تمھیں دھوکہ ہوا ہے، وہ بولا "ابنِ آدم کی قیمت تو روزِ ازل سے ہی تیس روپے مقرر ہو چکی ہے"

اس کے ساتھ ہی یکلخت سنّاٹا چھا گیا۔ ٹھک ٹھک کی آواز آنی بھی بند ہو گئی تھی۔ چند لمحے یہی عالم رہا۔ پھر یکایک ہجوم میں حرکت ہوئی اور وہ سب لوگ پہاڑی کی طرف بھاگ

اُٹھے۔ کچھ دیر بعد ایک جلوس ایک لاش کو اُٹھائے نیچے میدان میں آکر رک گیا۔

لاش کو میدان میں رکھ کر وہ جلوس چبوترے پر آ گیا۔ اور اس شخص کو ساتھ لے کر پھر پہاڑی کی طرف چل دیا۔ میں نیچے اتر آیا اور لاش کے سرہانے بیٹھ کر اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔

"ارے تم!" میرے منہ سے نکلا اور میری نظریں بے اختیار چبوترے کی طرف اُٹھ گئیں۔ لیکن جلوس اب پہاڑی پر پہونچ چکا تھا۔ اور تیشے کی آواز پھر سے سنائی دینے لگی تھی۔

—— تب میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ——" اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے کوئی نہایت ہی بھیانک خواب دیکھا ہے" میں نے کہا "اٹھو، منہ دھوؤ اور تیار ہو جاؤ —— آج انسان کو چاند پر آتارنے کے لیے راکٹ داغا جائے گا۔"

میں نے کھڑکی بند کر دی، وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے ایک کرسی کھینچی اور اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔

"انسان چاند پر اتر چکا ہے" نیچے نکڑ والی دکان پر سے ریڈیو نے اعلان کیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بولا: "یہ کس کی آواز ہے؟ کیا منادی والا پھر آیا ہے؟"

"انسان چاند پر اتر چکا ہے،" میں نے اُسے بتایا اور ریڈیو آن کر دیا۔

وہ یکلخت اُٹھا اور تیز تیز چلتے ہوئے جا کر کھڑکی کھول دی اور جھک کر نیچے گلی میں نہ جانے کس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "سنا تم نے! انسان چاند پر اتر چکا ہے۔"

نیچے گلی میں ایک نیند بھری آواز: "سنتے ہو! انسان چاند پر اتر چکا ہے" ایک ساتھ کئی آوازیں: "انسان چاند پر پہنچ گیا ہے۔"

ایک اور آواز (تمسخر بھرے لہجے میں) "انسان چاند پر پہونچ چکا ہے اب تمہارے خدا کا کیا ہوگا؟"

ایک دوسری (رقت بھری) آواز: "اس سے میرے اللہ کی عظمت، میرے کبریا کی کبریائی اور بڑھ گئی ہے۔"

میں نے ریڈیو آف کر دیا اور کھڑکی بند کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر اس نے مجھے روک

دیا اور کھڑکی میں جھک کر بولا۔ "انسان نے چاند کی سطح کو چھو لیا ہے۔"

ایک آواز: "بھلا، اب وہ وہاں کیا کر رہا ہوگا؟"

"میں بتاتا ہوں وہ کیا کر رہا ہے" وہ بولا، اور کھڑکی میں اور نیچے جھک گیا ——

"اب وہ اپنے دائیں بائیں، اوپر نیچے دیکھ رہا ہے۔ آکاش وہاں نیلا نہیں، کالا سیاہ ہے۔ اب اس نے جھرجھری لی ہے۔

شاید اُسے سردی لگ رہی ہے۔ وہاں فضا نہیں ہے نا اس لیے وہاں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے۔" وہ بولتا چلا گیا جیسے آنکھوں دیکھا حال سُنا رہا ہو: "دیکھو! اب وہ شخص کھڑا سوچ رہا ہے۔ اب اس نے ایک قدم اُٹھایا ہے اور چاند کی سطح پر کچھ سوچ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اُسے اپنے قدموں کی چاپ کیوں سنائی نہیں دے رہی ہے —— وہ دیکھو! جہاز میں بیٹھا دوسرا آدمی اسے پکار رہا ہے۔ مگر وہ اس کی آواز نہیں سُنتا۔ وہاں کوئی کسی کو نہیں پکار سکتا، کوئی کسی کی آواز سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہاں اپنے قدموں کی چاپ تک سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے —— لیکن رکو! وہ دیکھو:۔ جہاز کے اندر بیٹھے شخص نے اس کی کمر سے بندھی رسّی کو جھٹک دیا ہے۔ وہ شخص چونک کر جہاز کی طرف دیکھتا ہے اور اندر والے شخص کا اشارہ سمجھ کر جہاز کی طرف چل پڑا ہے۔ اب وہ جہاز میں بیٹھے شخص کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔

"یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے! ——" میں غصّے میں چلّاتا ہوں۔ اور کھڑکی بند کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہوں مگر وہ دھکّا دے کر مجھے پلنگ پر گرا دیتا ہے۔ اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور کھڑکی میں جھک کر نیچے گلی میں دیکھنے لگتا ہے۔

"... اب جہاز میں بیٹھے دوسرے شخص نے اس کے ہاتھ میں ایک تیشہ پکڑا دیا ہے اس نے تیشہ لے لیا ہے اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ ساتھی ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھا رہا ہے۔ اب وہ شخص تیشہ لے کر جہاز سے باہر نکل آیا ہے، اور سامنے پہاڑی کی طرف چل دیا ہے —— اب وہ پہاڑی کے دامن میں پہنچ گیا ہے، مگر رُکتا نہیں۔ وہ چلتا چلا جا رہا ہے، بڑھتا چلا جا رہا ہے —— کیونکہ —— کیونکہ ——"

"کیونکہ کیا؟" میرے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکل جاتا ہے۔

"—— کیونکہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہاں اس پہاڑی کے پیچھے کیا واقعی دودھ

کا دریا ہے۔"

وہ یکایک خاموش ہو جاتا ہے، اور میں حیرت اور خوف سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں ——— وہ کھڑکی میں اور نیچے جھک جاتا ہے اور اس کی آواز ایک بار پھر سارے ماحول پر چھانے لگتی ہے . . .

. . " اب جہاز کے اندر بیٹھا آدمی پریشان ہو اٹھا ہے . . . اور ——— اور ——— اس نے پھر رسّی کو جھٹک دیا ہے۔ وہ شخص لڑھک کر پہاڑی سے نیچے آگیا ہے۔ اب اس نے تیشہ اُٹھا لیا ہے۔ اور اُسے پوری قوّت سے ایک پہاڑی پر دے مارا ہے۔ مگر تیشہ گنگ ہے۔ اس کی کوئی آواز نہیں آتی ——— یہاں قدموں کی چاپ نہیں۔ کوئی کسی کو پکارتا نہیں، تیشے کی ٹھک ٹھک بھی نہیں۔ اب اس نے پتھر اُٹھا کر جھولے میں ڈال لیے ہیں اور جہاز کی طرف بڑھ گیا ہے . . ."

جونہی وہ سانس لینے کے لیے رُکتا ہے، میں کھٹاک سے کھڑکی بند کر دیتا ہوں نیچے گلی میں شور سا ہونے لگتا ہے۔

" سنتے نہیں ہو! شاید نیچے منادی والا آیا ہے۔" وہ خفگی سے کہتا ہے اور زبردستی کھڑکی کھول دیتا ہے ——— " دیکھو، اب راکٹ داغ دیا گیا ہے ———" وہ نیچے جھک کر گلی میں کہتا ہے۔" اور جہاز چاند کی سطح سے اوپر اُٹھ گیا ہے اور خلا میں پہونچ گیا ہے ——— چاند اب دُور، بہت دُور پیچھے سمٹ رہا ہے . . ."

" اللہ ہو! ——— اللہ ہو! ——— دُور پہاڑی کی طرف سے ایک آواز آتی ہے۔

" ہا! ہا! ہا! " ایک قہقہہ سُنائی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مجمع کے بکھرنے کی آواز آنے لگتی ہے ——— لیکن وہ بولتا چلا جا رہا ہے ——— " ارے دیکھو! ——— اب جہاز کی کھڑکی کھُل گئی ہے، اور وہ شخص اس میں سے نکل کر باہر خلا میں پھسل رہا ہے۔ چند گز خلا میں چل کر اس نے یک لخت وہ رسّی جو اُسے جہاز سے منسلک کیے ہوئے تھی، توڑ دی ہے۔ جہاز کی تمام بتیاں یک دم جل اُٹھی ہیں۔ لیکن جہاز اب بہت آگے نکل گیا ہے اور دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے ——— اب وہ شخص خلا میں تیر رہا ہے ——— اکیلا ——— تنہا ———" یکایک گلی میں شور سا اُٹھنے لگتا ہے ——— وہ

کھڑکی میں بہت نیچے جھک گیا ہے۔ اور اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی ہے —— بہت ہی دھیمی —— وہ کہہ رہا ہے . . . " وہ بالکل اکیلا ہے۔ بالکل تنہا —— تمام کائنات میں صرف ایک وہ —— ایک انسان تمام کائنات میں پھیلا ہوا —— افق تا افق، فلک در فلک —— عرش تا فرش . . . "

نیچے گلی میں شور بہت بلند ہو گیا ہے اور پھر یک لخت سناٹا چھا جاتا ہے۔

OO
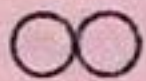
کمارپاشی

پہاڑ سے اترنے والا پہلا آدمی میرے جاننے والوں میں سے تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی میرے جاننے والوں میں سے کوئی شخص پہاڑ سے نیچے اترا ہو لیکن مجھے یا کسی کو کسی ایسے حادثہ یا واقعہ کا علم نہیں ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک پہاڑ سے اترنے والا وہ پہلا آدمی تھا۔ اس نے سادہ لباس پہن رکھا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں صد سطری حکم نامے کا کاغذ تھا۔ پہاڑ سے اترنے کے بعد وہ تیزی سے وادی کی طرف بڑھنے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ وادی کے لوگ سو رہے تھے۔ کہنا آسان نہیں تھا کہ اس وقت دن تھا یا رات تھی آسمان گھرے کالے بادلوں سے اٹا ہوا تھا اور پوری وادی تاریک فصیلوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ پانی مسلسل کئی گھنٹے برسا تھا اور اب بھی ننھی ننھی بوندیں جگہ جگہ اڑی اڑی پانیوں پر گر کر آواز پیدا کر رہی تھیں۔ قدم قدم

صد سطری حکم نامہ

پر گنجان درخت سیاہ بھوتوں کی طرح جھلاہٹ میں ہوا کو پیٹ رہے تھے مگر وہ ان سب سے بے خبر تیزی سے وادی کی طرف بڑھ رہا تھا لوگ سو رہے تھے۔

کون جانتا تھا کہ کوئی اس موسم میں بھی مسلسل سفر میں ہے اور وادی کے لوگوں سے ملنے کے لیے بے تاب ہے ——— کون جانتا تھا کہ کوئی ان سیال اندھیروں میں بھی ان کے لیے جاگ رہا ہے اور مسلسل سفر میں ہے۔ وادی میں سینکڑوں مکان تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر وہ رک جاتا تھا اور مکان کو تاریک اور خاموش پاکر پھر آگے بڑھنے لگتا تھا، پیروں سے پانی اچھالتا ہوا اندھیروں سے بے نیاز لگتا تھا۔ اس تاریک گنبد میں بھی اسے راستہ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ صحیح اور متوازن قدموں کے ساتھ وہ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ صد سطری حکم نامے کا کاغذ اب بھی اس کے دائیں ہاتھ میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

وہ اچانک رکا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں نے معبد کے بھیگے ہوئے شکستہ

میناروں کا احاطہ کیا اور پھر وہ تیزی سے پرانے مسجد کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کاٹھ کا بدرنگ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جیسے صدیوں سے اسی کا منتظر ہو وہ اندر داخل ہو گیا۔ مسجد ویران پڑا تھا اس نے آواز لگائی، پورے زور کے ساتھ "میں آگیا ہوں"۔ ۔ ۔ مسجد کا گنبد اس کے الفاظ لوٹاتے ہوئے گونجنے لگا: میں آگیا ہوں ۔ ۔ ۔ میں آگیا ہوں ۔ ۔ ۔ میں آ ۔ ۔ ۔

مسجد میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے اور اس کی آواز کے سوا مسجد میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ مزید سوچے اور انتظار کیے بغیر اچھل کر منبر پر چڑھ گیا اور اونچی میٹھی مگر قدرے غیر انسانی آواز میں اذان دینے لگا۔ اس کی آواز یہاں سے وہاں تک وادی بھر میں گونجنے لگی۔ لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے جاگنے لگے۔ ہر آدمی اپنے طور پر حیران تھا اور خود سے ہی پوچھ رہا تھا: یہ اذان دینے والا کون ہے؟ آدھی رات اور مسجد میں اذان۔ آخر یہ کون ہو سکتا ہے؟

مسجد کے باہر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ وہ اب بھی منبر پر کھڑا تھا اور اس کی آواز اب بھی فضا میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہر شے سے بے خبر تھا۔ شاید اس کا پورا وجود اس کی آواز بن گیا تھا اور وہ یہاں سے وہاں تک پوری وادی میں گونج رہا تھا۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو مسجد کے اندر باہر ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ نم اندھیرو میں کالی پرچھائیوں نے منبر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔

"تم کون ہو؟ اور آدھی رات میں اذان دینے کے لیے تمھیں کس نے بھیجا ہے؟: ایک آواز۔

کیا تم پہاڑ سے اتر کر ادھر آنے والے پہلے آدمی ہو؟ دوسری آواز۔

اس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا: "میں صدسطری حکم نامہ لایا ہوں۔"

اس پر سب نے اصرار کیا کہ یہ حکم نامہ انھیں پڑھ کر سنایا جائے۔ مگر اس نے جواب دیا: "مجھے یہ حکم نامہ پڑھ کر سنانے کی اجازت نہیں ہے۔"

یہ سن کر ایک نوجوان آگے بڑھا: "لاؤ ـــــ اسے میں پڑھ کر سناتا ہوں۔"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا: فرمایا گیا ہے کہ یہ حکم نامہ وادی کے لوگوں کو اس وقت پڑھ کر سنایا جائے جب مجھے قبر میں اتارا جائے" چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر چاروں طرف شور مچ گیا: ہم تمھاری موت کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہ حکم نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔۔۔ آج، ابھی، اسی وقت۔

لوگوں کا ایک بے پایاں ہجوم تھا اور شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا: آج ابھی، اسی وقت۔۔۔

وہ بدستور منبر پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ پرسکون تھا اور وہ بڑی خاموشی سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا" اس نے بآواز بلند کہا: میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔۔۔"

کوئی ہجوم میں سے باہر نکلا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا: یہ اس طرح نہیں مانے گا، اسے معبد کے احاطے میں زندہ گاڑ دو ــــــ

یہ سن کر وہ مسکرایا: تم مجھے نہیں مار سکتے۔ اس لیے کہ میری موت کا دن اس وادی کے تمام لوگوں کا آخری دن ہوگا۔

گہری کالی پرچھائیوں میں ہراس چھا گیا: چاروں طرف ہڈیوں کی سی خاموشی تھی اور نم اندھیروں کا گاڑھا دھواں وادی کے اوپر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پھر پرچھائیوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی ایک پرچھائیں آگے بڑھی: یہ وادی کا بوڑھا گل پتی تھا جس کا سب لوگ احترام کرتے تھے۔ اس نے خاموش پرچھائیوں سے کہا:

عزیزو! ہمیں ان کا کہا مان لینا چاہیے۔ صدسالہ حکم نامہ سننے کی ضد چھوڑیے اور اپنے مہمان کا سواگت کیجیے۔

سب لوگ بدستور خاموش اور بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ گل پتی نے پھر کہا: اس وادی کی قدیم رسم کے مطابق آپ سب میرے ساتھ مل کر اپنے مہمان کو سلام کریں۔

یہ سن کر سب لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر منبر پر کھڑے ہوئے مہمان کو تین بار سلام کیا۔ گل پتی آگے بڑھا اور اس کے ساتھ پانچ نوجوان کنواری لڑکیاں بھی بڑھیں جنھوں نے مہمان کو سہارا دے کر منبر سے نیچے اتارا۔ گل پتی نے اپنے مہمان سے مخاطب ہو کر کہا: آج سے آپ

پنچ دیو کے نام سے اس وادی کے خصوصی باشندے کی حیثیت سے رہیں گے اور رواج کے مطابق جن پانچ کنواریوں نے آپ کے جسم کو چھوا ہے، آج سے آپ اُن کے شوہر ہیں اور ان کے جسموں کو برتنے کا آپ کو حق ہے۔

پنچ دیو نے صد سطری حکم نامہ کا کاغذ کُل پتی کو سونپتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا: میں یہ حکم نامہ آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ فرمایا گیا ہے کہ جب میری موت کے بعد مجھے قبر میں اتارا جا رہا ہوگا تو کوئی شخص پہاڑ سے اتر کر اس وادی میں آئے گا اور وہی یہ حکم نامہ آپ لوگوں کو پڑھ کر سنائے گا۔" کُل پتی نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے حکم نامے کے کاغذ کو تھام لیا۔

ایک ایک کر کے سب لوگ معبد سے باہر نکلنے لگے۔ سب سے پیچھے پنچ دیو تھا اور اس کے اغل بغل اس کی پانچ نئی بیویاں جو سر جھکائے چل رہی تھیں۔

جب لوگ معبد سے نکل رہے تھے: دُور مشرقی افق سے ٹھنڈا نرم اور لپتان سا سُرخ سورج نمودار ہو رہا تھا۔ بوندا باندی رک گئی تھی۔ دھواں دھار اندھیرے چھٹ رہے تھے۔ اور نحیف اجالوں میں لوگ ایک دوسرے کو صاف دیکھ رہے تھے۔

پنچ دیو اب مستقل طور پر وادی میں رہنے لگا۔ اپنی پانچ بیویوں سے اس نے سیکڑوں بچے پیدا کیے۔ وادی میں اس کے ذمّے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا کہ وہ ہر شعبے میں وادی کے لوگوں کی رہ نمائی کرتا تھا۔ اور وادی کے مختلف تہواروں میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔

مذہبی معاملات ہوں یا پھر سیاسی یا سماجی معاملات سب میں اس کے مشورے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اور اس کی ہدایات پر عمل کرنا وادی کا ہر آدمی بمعہ کُل پتی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہفتہ میں ایک بار پرانے معبد کے احاطے میں ایک عام نشست منعقد ہوتی تھی، جس میں وادی کے مختلف تازہ مسائل پر پنچ دیو اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔

لیکن ایک روز جب وادی کے کچھ بزرگ صبح کی عبادت کے لیے معبد میں داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں ایک عجیب ہولناک منظر دیکھا۔ ہر آدمی سر سے پانو تک لرز گیا۔ منبر کے نیچے پنچ دیو خون میں لت پت آخری ہچکیاں لے رہا تھا اور اس کے قریب ہی بوڑھا کُل پتی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں لہو بھری تلوار چمک رہی تھی اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور وہ بے حد طیش میں نظر آ رہا تھا۔ سب لوگ پھٹی پھٹی مُردہ آنکھوں سے کُل پتی کی طرف

دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کریں، گل بتی نے کہا: کیا دیکھ رہے ہو ـــ؟
اسے واقعی میں نے قتل کیا ہے۔ اس کا مرجانا ہی بہتر تھا۔

"لیکن کیوں"؟ سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے صد سطری حکم نامہ پڑھ لیا ہے۔"

لوگ خوف وہراس کے نشیب میں گرنے لگے: تو کیا آج کا دن ہم سب کا۔۔۔ اور اس وادی کا آخری دن ہو گا؟

گل بتی مسکرا دیا! اس نے جیب سے صد سطری حکم نامے کا کاغذ نکالا، اسے کھولا اور کہا: تو تم بھی پڑھو۔۔۔

لوگوں نے جب حکم نامے کا کاغذ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ تڑا مڑا کاغذ بالکل کورا تھا۔ اس پر ایک لفظ بھی رقم نہیں تھا۔

سب لوگ طیش میں آگئے۔ ان کا خون کھولنے لگا اور وہ معبد سے نکل کر سیدھے پنج دیو کی حویلیوں کی طرف بھاگنے لگے۔ پنج دیو کے سیکڑوں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور اس کی پانچ بیویوں کو بے لباس کر کے وادی میں گھمایا گیا اور آخر میں انھیں اسی جگہ لایا گیا جہاں پنج دیو کی لاش کو دفنایا جاتا تھا۔

شام کے دھندلکوں میں پنج دیو کی خون میں لت پت لاش کے ساتھ اس کی بے لباس بیویوں کو بھی زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے اور گہری نیند سو گئے۔

وادی کے لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔ آسمان گہرے کالے بادلوں سے اٹا ہوا ہے اور پوری وادی تاریک فصیلوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ پانی مسلسل کئی گھنٹے برسا ہے اور اب بھی ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی ہیں۔

کہیں دور کوئی شخص پہاڑ سے اترنے کے بعد تیزی سے وادی کی طرف بڑھ رہا ہے اس نے سادہ لباس پہن رکھا ہے اور اس کے دائیں ہاتھ میں صد سطری حکم نامے کا کاغذ پھڑ پھڑا رہا ہے۔

∞